ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

مئی-اگست ۲۰۲۰ء | جلد ۱۱ | شمارہ ۱۱ | رمضان-ذی الحجہ ۱۴۴۱ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد انصاری 9045616218
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

شرح خریداری

فی شمارہ: 25:00روپے
سالانہ: 250:00روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ: 500:00روپے
بیرونی ممالک: 30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال): 4000:00روپے

Bank Acount Detail: Mr Saeed Ahmad Ansari
Acount No: 6561000100039197
IFSC code: PUNB0656100
Punjab National Bank, Medical Road, Aligarh-202002
Mob. 9808850029

خط و کتابت کا پتہ:

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر ڈی، کوارسی بائی پاس، علی گڑھ
e-mail: nidaeaetidal@gmail.com

Designed and composed by Abdullah Maroofi, Mob. 8218439622; email-almarufi.abdullah369@gmail.com

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at Ideal Graphics Enterprises, Patwari Nagla, Aligarh

visit us: www.nadwifoundationaligarh.org

فہرست مضامین

۱-	قرآن کا پیغام	قربانی کی حقیقت اور پیغام	محمد عارف ندوی
۲-	اداریہ	فکری زاویے	مدیر	۳
۳-	قندِ مکرر	عیدِ قرباں کا پیغام	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۱۳
۴-	اسلامی تعلیمات	بیماری اور بیمار پرسی کے آداب	حافظ کلیم اللہ عمری مدنی	۱۸
۵-	فقہیات	غبنِ فاحش یا معمول سے زیادہ نفع لینا	ندیم احمد انصاری	۲۵
۶-	// //	نصابِ زکوٰۃ: ایک غور طلب مسئلہ	ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی	۲۸
۷-	مطالعۂ قرآن	کامیابی کی قرآنی علامتیں	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۳۳
۸-	اصلاحیات	قتل؛ ایک سنگین جرم اور گناہِ کبیرہ	عبدالرشید طلحہ نعمانی	۴۴
۹-	اصولِ تحریر	کہیں ہماری تحریر ہمارے حظِ نفس کا ذریعہ تو نہیں؟	محمد فرید حبیب ندوی	۴۷
۱۰-	تعلیم و تربیت	نوجوان بچوں کا شام کو گھر آنا	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۴۹
۱۱-	نقد و نظر	امام ابوحنیفہؒ- چند الزامات اور ان کی حقیقت	محمد فرید حبیب ندوی	۵۷
۱۲-	مطالعات	زینب الغزالی کی تفسیر 'نظرات فی کتاب اللہ'	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۶۴
۱۳-	// //	زجاجۃ المصابیح — ایک معروضی مطالعہ	صداقت علی قاسمی مظاہری	۶۸
۱۴-	آدابِ زندگی	''میں یہاں سے گزر رہا تھا''	جاوید چودھری	۷۴
۱۵-	شخصیات	حیدرآباد کی عظیم شخصیت مولانا نصیر الدینؒ	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۷۷
۱۶-	قضیۂ ایا صوفیہ	ایا صوفیہ- اہمیت و تاریخ	ضیاء الرحمٰن چترالی	۸۱
۱۷-	// //	ایا صوفیہ'' کی بحالی پر اضطراب یا اسلاموفوبیا کا اظہار؟	شیخ احمد الریسونی/ترجمہ: محمد سہیل ندوی	۸۴
۱۸-	// //	ترکی کی مسجد ایا صوفیہ کا قضیہ	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۸۶
۱۹-	// //	قسطنطنیہ سے استنبول بننے کی کہانی	ڈاکٹر عمیر انس	۸۸
۲۰-	// //	علامہ ابن القیم کی احکام اہل الذمہ سے ملخص تحریر	حسن عمار	۹۵
۲۱-	شعر و ادب	نذرِ عقیدت و محبت بحضور سرورِ کائنات ﷺ	محمد سمعان خلیفہ ندوی	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

ادار یہ

فکری زاویے

معذرت: قارئین کرام! سب سے پہلے آپ کی خدمت میں یہ معذرت پیش کرنا ضروری ہے کہ اپریل کے بعد کوئی شمارہ شائع نہ ہوسکا، اپریل کا شمارہ بھی تاخیر سے آپ کی خدمت میں پہنچا، اب نقل وحمل کی ذرا سہولت ہوئی تو ہم مئی تا اگست کا شمارہ آپ کی خدمت میں پیش کررہے ہیں، یقیناً اس حساب سے صفحات بہت کم ہیں، مگر ہماری مالی مجبوری بھی کسی وبائی بحران سے کم نہیں، اس وبائی بحران نے انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا ہے، سب سے زیادہ اس کی چوٹ دینی مدارس پر پڑی ہے، اس لیے خدارا اس معذرت کو قبول فرمایئے اور ہمارے ادارے کو ہر لحاظ سے اپنے تعاون میں یاد رکھیے، علی گڑھ میں اس ادارے کا قیام بڑی امیدوں کے ساتھ کیا گیا تھا، اس رسالہ کی اشاعت بھی خاص مقاصد سے شروع کی گئی تھی، یہ ادارہ ہر طرح آپ کی معاونت کا مستحق ہے، ہمیں امید ہے کہ نہ صرف آپ ہماری معذرت کو قبول فرمائیں گے بلکہ ادارے کے لیے معاون ثابت ہوں گے۔

کرونا کا بحران

کرونا (Covid19) کا ظہور ایک وبائی مرض کی شکل میں ہوا، چین کے ایک شہر ووہان سے اس کی ابتدا ہوئی، آپ اس پر بہت کچھ پڑھ چکے ہوں گے، بہت کچھ دیکھ چکے ہوں گے، ہمیں اس سے بحث نہیں اور یہ ہمارا میدان بھی نہیں البتہ چند بہت اہم پہلوؤں کا ذکر کرنا ہے جن کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے، یہ تو ایک تجربہ ہے اور زندگی میں تجربات ہوتے ہی رہتے ہیں۔

ہم مسلسل سوشل میڈیا پر اس بابت اپنے فہم کے مطابق لکھتے رہے، یہ ایک وبائی مرض ہے جیسے بہت سے وبائی مرض ہوتے ہیں، نزلہ، کھانسی، بخار وغیرہ، ڈاکٹر بسوا روپ چودھری کے مطابق جیسے بہت سے فلو ہوتے ہیں ویسے ہی یہ بھی ایک فلو ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں، اب تک جو رپورٹس، خبریں اور ویڈیوز وائرل ہوئے ہیں ان سے کرونا کی وبا اور اس کے ساتھ اس کی Conspiracy اور گھناونے سیاسی کھیل کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہ گیا ہے، دنیا نے اس پر سیاست کیوں کی اور اس کے پیچھے کیا سازش تھی یہ راز تو بعد میں کھلیں گے اور جب کھلیں گے تو بڑی کہانیاں سامنے آئیں گی، ابھی دو دن پہلے کی خبر ہے کہ امریکہ نے WHO سے خود کو الگ کرلیا

ہے، اس کے پیچھے کیا راز ہے معلوم نہیں، مگر خود یہ خبر سوچنے پر مجبور کرتی ہے، اسی کے متصلاً بعد اس خبر پر نظر پڑی کہ سنگاپور سے ایک لیڈی ڈاکٹر بھاگ کر امریکہ گئی ہے، اس نے اپنی ریسرچ میں کچھ انکشافات کیے تھے، اس کے سپروائزر نے اسے بولنے سے منع کیا تو وہ بھاگ کر امریکہ پہنچی اور اس نے وہ راز وہاں بیان کیے، اس کے مطابق خود WHO اور چین اس میں شریک ہیں۔

ہمارے ملک میں اس وبا کو حکومت نے جس طرح پیش کیا اور اس پر جس طرح گندی سیاست کی وہ لائق مذمت ہے، کھلے آسمان کے نیچے بھوکے پیاسے پیدل چلتے انسان مہینوں نظر آتے رہے، اسپتالوں کو یکسر بند کر دیا گیا، اب پورے ملک میں کوئی مریض ہی نہیں، کوئی مرض ہی نہیں، جو مرتا ہے صرف کرونا سے مرتا ہے، اس سے بڑھ کر اور کیا تماشا ہوگا، شک کی بنیاد پر ایک شخص کو اٹھایا اور خبر آئی کرونا کا مریض پایا گیا، پھر ۱۴؍دن بعد چھوڑ دیا گیا خبر آئی صحیح ہو گیا، جب مرض کی تحقیق ہی نہیں ہوئی، اس کا علاج دریافت ہی نہیں ہوا تو پھر آخر یہ لوگ مرض سے نجات کیسے پانے لگے، اس دوران بے شمار ڈاکٹروں کے ویڈیو سامنے آئے، دنیا میں اتنے اختلافات کبھی نہیں دیکھے گئے جتنے ان ویڈیوز میں پائے گئے، کرونا کیسے ہوتا ہے اور اس کے بچاؤ کا طریقہ کیا ہے صرف ان دونوں سوالوں کے جواب میں ڈاکٹروں نے اختلافات کی تاریخ میں اپنا ریکارڈ قائم کر دیا، ہماری حکومت اور میڈیا کا سب سے گھناؤنا عمل یہ تھا کہ انھوں نے اس کو ایک مرض نہیں دہشت کے نام سے متعارف کرایا، انسانی زندگی اجیرن کر کے رکھ دی۔ کسی بھی وبا سے احتیاط اور تحفظ کی تدبیریں کرنا لازم ہے، مگر انسان انسان سے بھاگنے لگے، انسانیت کو ایسی نفسیات میں مبتلا کر دیا جائے کہ وہ مریض کے قریب نہ جائے، یہ نہ اخلاقی و شرعی طور پر صحیح ہے اور نہ انسانی طور پر، مرض سے احتیاط لازم ہے مگر مریض سے نفرت و فرار کی گنجائش نہیں۔

بہر کیف حکومت کی ناعاقبت اندیشی کے سبب ملک کے باشندوں کو بالخصوص غریب خاندانوں اور تعلیمی اداروں کو جس معاشی بحران کا سامنا ہے فی الحال اس سے نمٹنے کی سب سے زیادہ اہمیت ہے، بے روزگاری پہلے ہی کیا کم تھی اب اس میں اور اضافہ ہو گیا ہے، بھوک مری شباب پر ہے، کاروبار ٹھپ ہیں، آدمی آدمی پریشان ہے، اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے سوچنا اور لائحہ عمل تیار کرنا بہت ضروری ہے، لاک ڈاؤن کے درمیان جس طرح سے ہماری قوم نے بلاتفریق مذہب دل کھول کر انسانیت کی خدمت کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، ملک کی ۸۰؍فیصد آبادی وہ کام نہ کر سکی جو ملک کی ۲۰؍فیصد آبادی نے کر دکھایا، خدارا انسانی ہمدردی، جذبۂ تعاون، غمخواری اور انسانیت نوازی کی اس بہترین مثال کو گنگا جمنی تہذیب اور انسانیت یعنی Humanism جیسی پرفریب تعبیرات کی نذر مت کیجئے، یہ جذبہ خالص اسلامی تھا، یہ دراصل صدقہ تھا اس نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم سے ادنیٰ نسبت کا جس کی پہچان تھی دوسروں کی مدد کرنا، دوسروں سے ہمدردی کرنا، دوسروں کے غم بانٹنا، دوسروں کے آنسو پونچھنا خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلانا، جس ذات گرامی نے یہ سکھایا کہ خیر الناس الی اللہ أنفعھم للناس اللہ کے یہاں لوگوں میں سب سے محبوب وہ ہے جو لوگوں کے لیے مفید و نافع ہو، جس نے یہ تعلیم دی کہ أحب الناس الی اللہ انفعھم للناس اللہ کے یہاں لوگوں میں سب سے محبوب وہ ہے جو لوگوں کے لیے سب سے زیادہ نافع و نفع بخش ہو، سلام ہو اس نبیؐ پر جس کے نام لیواؤں نے اس گئی گذری حالت میں بھی خدمت خلق کی مثال قائم کی، ان خدمات کو مسلمانوں کی مذہبی تعلیم، خدمتِ خلق، اسوۂ نبوی کے طور پر پیش کیجئے اور ان پر پُرفریب اصطلاحات کا پردہ ڈالنے سے گریز کیجئے، آئندہ کے لیے بھی پرعزم رہیے، اللہ پر یقین رکھیے اور قوم کو اس معاشی بحران سے نکالنے پر توجہ دیجئے اللہ حامی و ناصر ہوگا۔

موجودہ صورت حال اور سرکار کے متعصّبانہ رویے

اس وقت سارے عالم کو وبائی بحران کا سامنا ہے، بھارت کی حکومت نے اس بحران کو کئی اور بحرانوں کے ساتھ ملا کر ملک کو بہت پیچھے دھکیل دیا ہے، تالی تھالی والی اس سرکار نے ہم کو بھی موقع پرستی کے مرض میں مبتلا کر دیا، ہم جو پہاڑوں کے سامنے ڈٹ جایا کرتے تھے، ایک ہوں یا ایک ہزار مگر لات وہبل کی جے پکاری جائے تو اس کے بالمقابل اللہ اکبر کا نعرۂ مستانہ لگایا کرتے تھے، مگر پھر وہ وقت بھی آیا کہ ہم نغمۂ توحید کے ساتھ ساتھ سیکولرزم کے بنیادی اصول بھی بھول گئے، جس کی بنیاد پر اب تک ہم اس ملک میں اپنی شناخت اور اپنے تشخص کے ساتھ جیتے آئے ہیں۔

اس حکومت نے اچانک لاک ڈاؤن کی لعنت مسلط کی، ناکامیاں سامنے آئیں تو رخ تبلیغی جماعت کی طرف موڑ دیا، ذرا سکون ہوا تو CAA مخالف تحریک میں شامل نوجوانوں کو اٹھانا شروع کر دیا، ظالمانہ وجابرانہ گرفتاریوں کا جال بچھا دیا، حکومت یہ بھول گئی کہ قید و بند سے تحریکیں ختم نہیں ہوتیں، بلکہ حکومتی جبر وتشدد سے عوامی تحریکات کو نئی زندگی ملا کرتی ہے، تاریخ میں اس کی تفصیلات درج ہیں، مگر ظالم جب تیزی سے زوال کی طرف بڑھتا ہے تو اسے تاریخ سے سبق لینے کا خیال نہیں ہوتا، اس وبائی بحران کے بعد جو دنیا وجود میں آئے گی اس میں بہت کچھ بدلا ہوا ہوگا، ایک امریکی مفکر کا کہنا ہے کہ کرونا کے سبب جو غیر متوقع اور اچانک فیصلے لیے گئے ان سے نیشنلسٹ حکمرانوں کو بہت فائدہ ہوگا، وہ ان فیصلوں کی آڑ میں اپنی دیش بھکتی کا پرچار کریں گے اور آئندہ مزید مضبوط ہوں گے، ہمارے یہاں کے منظر نامہ میں یہ بات صاف دکھائی دے رہی ہے اس لیے اس وقت کی جتنی ناکامیاں ہیں انھیں محفوظ رکھیے، سارے ثبوت تصاویر اور ویڈیو کی شکل میں اپنے پاس رکھیے، وقت آنے پر سوشل میڈیا کو ان ناکامیوں سے بھر دینا ضروری ہوگا۔

اب لاک ڈاؤن کو رفتہ رفتہ کھولا جا رہا ہے، زندگی کی گہما گہمی بڑی حد تک شروع ہو چکی ہے، سڑکیں اور بازار انسانوں سے بھرے ہیں، انھیں دیکھ کر لگتا ہی نہیں کہ کرونا جیسی وبا کا خطرہ اب بھی باقی ہے، اچھی بات ہے کہ معمولاتِ زندگی رفتہ رفتہ بحال ہو رہے ہیں، مگر قابل افسوس یہ ہے کہ مساجد اب بھی بند ہیں، تعلیم گاہوں پر اب بھی تالے ہیں، پہلے سرکار نے تالی تھالی بجوائی، پھر دیے جلوا کر مظہر شرک میں مبتلا کیا، نماز عید کی اجتماعیت کو تار تار کر دیا، جنھیں خود گرین زون قرار دیا وہاں بھی مساجد پر پابندی ہے، کورٹ، کچہری، آر ٹی او اور دیگر سرکاری دفاتر، ہوٹل، ڈھابے، بازار ہر جگہ غیر محتاط بھیڑ ہے مگر کرونا کا خطرہ ہے تو نماز پڑھنے میں، مگر ہم بول نہیں سکتے کیونکہ ؎

سرِ تسلیم ہے خم اذن و اجازت کے بغیر
ہم تو سرکار کے مداح ہیں خلعت کے بغیر

ہم نے پندرہ دن قبل ہی عید الاضحیٰ اور قربانی کے متعلق لوگوں کو توجہ دلانا شروع کیا لیکن ہنوز قیامت کا سناٹا ہے، گویا لوگوں نے خود ہی فیصلہ کر لیا ہے کہ قربانی نہیں کرنا ہے، واہ ری بزدلی، قربانی میں بھیڑ نہیں Social Distancing کا کوئی مسئلہ نہیں پھر بھی لوگ خاموش، سرکار سے قائدین کو لاجک تو پوچھنا چاہیے؟ مگر وہ کیا پوچھتے، کمالِ عیاری سے سرکار نے ہر سینیچر اتوار کے لاک ڈاؤن کا فیصلہ کر کے عید الاضحیٰ اور قربانی کو کرونا کی نذر کرنے کا فیصلہ سنا دیا، یاد رکھیے انفرادی طور پر قربانی ہر حال میں کرنا ہے، کسی طرح بھی اس سے غفلت درست نہیں، البتہ اگر قربانی کا اجتماعی نظم نہ ہو پایا تو بہت سے لوگ اس فریضہ سے سبک دوش نہ

ہوسکیں گے، ظاہر ہے کہ ہر ایک کی یہ حیثیت نہیں ہوتی کہ وہ بکرا خرید کر قربان کرے، پھر جب بازار نہیں لگ رہے، اجتماعی قربانی کا نظم نہیں ہو رہا تو ظاہر ہے کہ بکروں کی قیمت آسمان پر ہوگی۔

لیکن ہم کو یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ جس حد تک ممکن ہو ہم قربانی کا فریضہ ادا کرنے کی کوشش کریں گے، یاد رکھیے کہ ایام قربانی میں اس عمل سے زیادہ محبوب اللہ کے یہاں کوئی عمل نہیں، آپ کوئی بڑے سے بڑا کارِ خیر کر لیں مگر وہ قربانی کا بدل نہیں ہوسکتا، اس لیے عزم کریں کہ قربانی کرنا ہے اور آخری حد تک اس کی کوشش کریں، جب عزم و کوشش کے باوجود آپ کامیاب نہ ہوں، ایام قربانی گذر جائیں اور آپ قربانی نہ کرسکیں تو پھر اب وہ رقم جس سے آپ کو قربانی کرنا تھا اسے صدقہ کر دیں، لیکن یاد رکھیں کہ یہ صدقہ بھی قربانی کا بدل نہیں، اگر آپ گرین زون میں ہیں تو ذمہ دار شہریوں کے ساتھ مل کر انتظامیہ کو مجبور کیجئے کہ وہ عیدالاضحیٰ کی ادائیگی اور قربانی کی رکاوٹوں کو دور کرے۔

منظر کو دیکھنا اور پسِ منظر میں سرکار کی نیت اور اس کی کوششوں کو سمجھنا، وقت و حالات کے مطابق سرکار سے پہلے شریعت کی روشنی میں خود ہی فیصلے لینا ہماری ذمہ داری ہے، اگر ہم ایسا نہیں کر پا رہے ہیں تو گویا ہم صحیح معنی میں اپنی ذمہ داری نہیں ادا کر پا رہے ہیں۔

ہمارے سوچنے کا زاویہ کیا ہو؟

ایا صوفیا قضیہ کے تناظر میں

پوری دنیا سے اگر مظلومیت کی خبریں ہیں، ہتک عزت کے واقعات ہیں، عصمتیں لٹنے، گودیں اجڑنے اور سہاگ چھننے کی خبریں ہیں تو وہ سب مسلمانوں کے بارے میں، ''ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات'' کا نظارہ ہر طرف بکھرا پڑا ہے، اب تو حد یہ ہے کہ ''صدی ڈیل'' کے ذریعہ قبلۂ اول کی حیثیت ختم کرنے، شہر القدس کو اسرائیل کا دارالحکومت بنانے، مغربی کنارے کو اسرائیل میں ضم کرنے کی تیاری ہے، وہ لوگ جنھوں نے خلافت عثمانیہ کو بیخ و بُن سے اکھاڑنے میں انگریزوں کا ساتھ دیا، جنھوں نے اسرائیل کے قیام میں اپنا کردار نبھایا، جنھوں نے ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کا ڈھونگ رچا کر اسرائیل کی توسیع کے لیے راہ ہموار کی وہ سب کے سب ''صدی ڈیل'' میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ ہیں، اس معاہدہ کے نفاذ پر راضی ہیں، پہلے ان کے ''کارناموں'' کے عوض ان کو جاگیریں دی گئیں، گویا استعماری طاقتوں نے عالم اسلام کے حصے بخرے کر کے اپنی کالونیاں قائم کیں، اب یہی راجہ مہاراجہ اپنے رجواڑوں کے تحفظ کے لیے یہود و نصاریٰ کی تہذیب و تمدن کو ان کے اشاروں پر فروغ دے رہے ہیں، قرآن کی واضح تصریحات اور حدیث نبوی کے واضح مطالبات سے قطع نظر وہ ''معتدل اسلام'' کے فروغ میں لگے ہیں، ''معتدل اسلام'' کا نعرہ لگا تھا تو ہم نے طویل مضمون لکھ کر مضمرات و خدشات کا اظہار کیا تھا، آج اس نعرے کے نتائج ویسے ہی ظاہر ہو رہے ہیں جیسے ''عرب قومیت'' کے بدترین نتائج ظاہر ہوئے تھے، صدی ڈیل کا مطلب ہے کہ امت کے ان برہمنوں نے گویا خود سپردگی کا فیصلہ کر لیا ہے، مکمل اطاعت و مغلوبیت کے لیے راضی ہو گئے ہیں، اسلام اور اس کے ماننے والوں کے لیے جس عزت و قوت اور عظمت و بالادستی کی قرآن نے بشارت دی ہے اس کو انھوں نے اپنی کتابِ زندگی سے نکال کر باہر کر دیا ہے۔

اس المناک اور غمگین صورت حال میں سلطنت عثمانیہ کے پایۂ تخت استنبول سے ایک خبر آتی ہے جس سے اہل ایمان کے دل خوشی سے رقصاں ہوتے ہیں، زبان شکر کی تسبیح میں مصروف ہوجاتی ہے، سر بارگاہ الٰہی میں جھک جاتا ہے اور یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ شاید خدا تعالیٰ کی طرف سے عظمت رفتہ کی واپسی کی ابتدا کا فیصلہ ہو چکا، خبر آئی تھی کہ مسجد آیا صوفیا کی حیثیت کو دوبارہ بحال کر دیا گیا، ۲۴ر جولائی کو جمعہ کی نماز سے دوبارہ وہ اہل توحید کے سجدوں سے آباد کرنے کے لیے کھول دی جائے گی، جس غلط اور جارحانہ فیصلہ سے اسے میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا تھا، تُرک عدالت نے اس فیصلہ کو غلط قرار دیتے ہوئے یہ نیا فیصلہ صادر کیا، اس فیصلہ کے نفاذ کے لیے جیسے ہی صدر ترکی نے منظوری دی دنیا بھر میں ایک طوفان کھڑا ہو گیا، مغرب کے اسلام دشمن چیخ پڑے اور فیصلہ کو اسلامی شدت پسندی کو فروغ دینے والا فیصلہ باور کرنے لگے، لبرلس (Liberals) اس کو بطور ایک انسانی یادگار کے علی حالہ باقی رکھنے کا نعرۂ مستانہ لگانے لگے، دوسروں کے مذہبی جذبات کی رعایت کا سبق پڑھانے لگے، ہندو پاک کے لبرلس بابری مسجد کا حوالہ دے کر کہنے لگے کہ طاقت کے بل پر ہندوؤں نے اگر مسجد کو مندر بنا دیا تو پھر کیا غلط کیا، سعودی ہرکاروں کا کیا پوچھنا اور ان کی عقلوں پر کیا ماتم! انھیں تو ترکی کے ہر اقدام بلکہ سعودیہ کے علاوہ ہر عالم، ہر تحریک اور ہر مسلمان کا ہر اصلاحی کام برا لگتا ہے، اس میں کیڑے نکالنا ان کی فطرت ثانیہ ہے، سعودیہ کی کفر نوازی اور اسلام سے کفر کی طرف اس کا سفر انھیں منظور ہے بلکہ اس کو منصوص بنانے میں بھی وہ کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے البتہ ترکی کا کفر سے نکل کر پھر سے عزت و اختیار کے ساتھ اسلام کی آغوش میں آنا انھیں پسند نہیں، یہ لوگ اپنے ان عرب منافق آقاؤں کے نقش قدم پر تھے جنھوں نے بابری مسجد کے قضیہ پر اسے بھارت کا داخلی معاملہ قرار دے کر ٹال دیا تھا مگر ایا صوفیا کے قضیہ پر یورپ سے زیادہ ''معتدل اسلام'' کے علمبرداروں کی چیخیں نکل رہی تھیں، ایسے موقع پر جبکہ عرصہ بعد کوئی ایک ایسی خبر آئی جو باعث اطمینان وسکون تھی، کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو باوجود اپنی اسلام پسندی کے اس فیصلہ پر خوشی تو کیا اپنے اطمیان کا بھی اظہار نہ کر سکے، ان کو نظریاتی طور پر اختلاف تھا مگر وہ اپنی نیت میں مخلص تھے خواہ ان کا موقف درست نہ ہو۔

سب سے پہلے تو یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ ایا صوفیا ایک مسجد تھی (۱)، سلطنت عثمانیہ کے سقوط کے بعد اتاترک نے ۱۹۳۱ء میں

(۱) یہاں ہمیں اس کی تاریخی حیثیت پر گفتگو نہیں کرنا، ہم ۲۰۱۵ء میں اپنے ایک مختصر سفر نامہ میں یہ تفصیلات درج کر چکے ہیں، وہاں یہ تفصیلات دیکھی جا سکتی ہیں یا پھر وہ سفر نامہ ہمارے مجموعہ مضامین ''عالم اسلام'' میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اس شمارے میں بھی کچھ مضامین شامل ہیں جن سے اس کی تاریخی حیثیت کا علم ہوگا، یہاں سفر نامہ سے وہ حصہ اختصار کے ساتھ حاشیہ میں نقل کیے دیتے ہیں۔ مسجد سلطان احمد سے نکل کر اس سے کچھ فاصلہ پر مسجد ایا صوفیا آئے، ابھی اس کے باہر ہی تھے کہ مسجد سلطان احمد میں عصر کی اذان ہوئی، اللہ اکبر کی صدا ختم ہوئی تو لگا کہ اب ٹکرا کر یہ آواز ایا صوفیا سے آرہی ہے، ہمارے دیگر ساتھیوں کا بھی یہی تاثر تھا لیکن پھر ایک خبیر نے یہ راز فاش کیا کہ اس میں بھی اذان شروع کر دی گئی ہے جس کی خبر ابھی لادینوں کو نہیں ہے بس اس وقت کا انتظار ہے جب نماز شروع کی جائے، مسجد ایا صوفیا وہ مسجد ہے جو عیسائی دنیا کے دل میں کانٹوں کی طرح چبھتی ہے، جس کے میناروں کو وہ چھوٹی آنکھ دیکھنا نہیں پسند کرتے، یہ مسجد در حقیقت ایک گرجا گھر ہے، اس کی تعمیر ۵۳۲ء سے شروع ہو کر ۵۳۷ء میں مکمل ہوئی، یہ بازنطینی حکمرانوں کے فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے، یہ گرجا اشبیلیہ کے گرجا گھر کی تعمیر سے قبل تقریبا ایک ہزار سال تک دنیا کا سب سے بڑا گرجا رہا، لاطینی زبان میں اسے، Sancta Sophia اور ترکی میں Ayasofya کہا جاتا ہے، اس کی بلندی ۱۸۰ر فٹ، چوڑائی ۲۴۰ر فٹ اور لمبائی ۲۶۹ر فٹ ہے، (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اسے بند کر دیا تھا، ۱۹۳۵ء میں اسے ایک میوزیم کی حیثیت سے دوبارہ کھول دیا تھا، اب جو مقدمہ تھا وہ میوزیم کے فیصلے کو بدل کر مسجد کی اصل حالت کو بحال کرنے کا تھا، یہ درست تعبیر ہے، یہ تعبیر ہی دجل وفریب اور تلبیس پر مبنی ہے کہ چرچ کو مسجد میں تبدیل کیا جارہا ہے، یہ تو سرے سے مقدمہ ہی نہیں تھا کہ اسے چرچ رکھا جائے، کیونکہ چرچ تو اسی دن ختم ہو گیا تھا جس دن سلطان محمد فاتح نے اسے اپنے مال خاص سے خرید کر وقف کیا تھا، یہ سلطان کا وقف تھا اور غالبا اسی وجہ سے ترکی کی اسلامی شناخت کو ختم کرنے والے اتاترک نے بھی اس کی ہیئت اصلی کو ختم کرتے وقت چرچ میں تبدیلی کرنے کی ہمت نہ کرتے ہوئے مسیحی دنیا کی خوشنودی کی خاطر اور ترکی میں سیکولرزم کے قیام کا ثبوت دینے کے لیے اسے میوزیم میں تبدیل کر دیا، یہ ایک الگ بحث ہے کہ فتح قسطنطنیہ سلطان نے اسے مسجد میں کیوں تبدیل کیا تھا، مگر جو کیا تھا صحیح کیا تھا شرعی، فقہی اور اس وقت کے بین الاقوامی قانون کے اعتبار سے، فاتح اگر بزور شمشیر کسی شہر کو فتح کرتا تھا تو اسے اختیار تھا کہ وہ غیروں کی عبادت گاہوں کو علی حالہ باقی رکھے یا اس میں تصرف کرے، یہ قانون ۱۹۲۸ء تک تسلیم شدہ تھا، یہاں بھی سلطان نے اپنے اعلیٰ اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کیا، بزور شمشیر چرچ پر قبضہ نہ کر کے انھوں نے مسیحیوں سے ان کی رضامندی حاصل کر کے اسے خریدا، یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ اس وقت قسطنطنیہ میں بہت سے چرچ تھے مگر بطور خاص ایا صوفیا کے ساتھ سلطان نے یہ رویہ کیوں اپنایا؟ (۱) وجہ یہ ہے کہ جس طرح قسطنطنیہ کے بارے میں عیسائیوں کا تقریباً یہ عقیدہ بن چکا تھا کہ اسے کوئی فتح نہیں کر سکتا اسی طرح وہ اس چرچ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے تھے، ان کے بادشاہوں کی تاجپوشی کی رسم یہیں پوری ہوتی تھی، سلطان جب استنبول میں داخل ہو گیا اور نبی پاک ﷺ کی پیشین گوئی کا مستحق قرار پایا تو اس کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ عیسائیوں کے غرور کی علامت، ان کے عالمی مرکز اور ان کے فتح وشکست کے آخری مرکز کو اپنی دسترس میں نہ لیتا، جبکہ عیسائی تادم آخر ایا صوفیا میں جمع تھے اور کسی امداد غیبی کے منتظر تھے، سلطان نے وہاں نماز پڑھ کر فتح کا اعلان تو کر دیا لیکن اس کی تبدیلی اسے خریدا اور پھر وقف کر دیا، پھر پرانے زمانے میں چرچ ہی جنگ وامن کے فیصلے کرتے تھے، مسیحی دنیا کی سپریم اتھارٹی چرچ ہوا کرتے تھے، معاملہ آج کے جیسا نہ تھا کہ اب تو چرچ نہ صرف سیاست بلکہ کاروبار زندگی سے بے دخل کر دیے گئے ہیں، چنانچہ ایا صوفیا چرچ ایک عسکری طاقت تھا، اگر وہ ایسا نہ بھی کرتا تو فقہی رُو سے اس کو اختیار تھا کہ اس کو بدل دے، اس بین الاقوامی قانون کی رو سے بھی جو ۱۹۲۸ء تک تسلیم شدہ تھا وہ اس کا مالک ہو چکا تھا اور اس کی ہیئت کو تبدیل کرنے کا مجاز تھا۔

سیکولرزم ولبرلزم کے دو غلے علمبردار نا معلوم کس منہ سے چیختے ہیں انھیں دنیا بھر میں پھیلی وہ مساجد نظر نہیں آتیں جنھیں باڑے، نائٹ کلب، میوزیم اور تجارتی مراکز میں تبدیل کر دیا گیا، انسانیت اور بین مذاہب رواداری کی دہائی دینے والے یہ بھول

(۱) (آج کے استنبول میں بھی تقریباً ۱۲۳/ چرچ ہیں جبکہ عیسائی آبادی تقریباً ۴۰۰۰/ پر مشتمل ہے، بلکہ شاید ترکی واحد وہ جگہ ہے جہاں تمام عیسائی فرقوں کے چرچ ہیں،)

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) عمارت دو منزلہ ہے، سنگ مرمر کا فرش ہے، خوبصورت قسم کی نقاشی ہے، ترکوں نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کی فتح کے بعد اس میں منبر ومحراب کا اضافہ کر کے اسے مسجد میں تبدیل کر دیا، عثمانیوں نے اس کی نقاشی، رنگ وروغن اور تزیین کاری میں خوبصورت ترین اضافہ کیا، سولہویں صدی کے مشہور زمانہ معمار سنان پاشا (۱۵۰۶ء-۱۵۹۶ء) نے اس میں نئے منارے نصب کیے، وسط میں حضور ﷺ اور خلفاء کے نام کی تختیاں لگائی گئیں، نیچے سے دیکھا تو بڑی چھوٹی معلوم ہوئیں بالائی منزل پر گئے تو محسوس ہوا کہ ان کی گولائی ۲۰/ فٹ سے کم نہیں ہوگی، یہ عمارت کئی مرتبہ زلزلوں سے متاثر ہو چکی تھی مگر ترکوں نے اس کے ارد گرد تعمیر کر کے اس کو ایسا مضبوط سپورٹ دیا کہ وہ آج تک قائم ہے، ۱۴۵۳ء سے ۱۹۳۵ء تک اس کی مسجد کی حیثیت باقی رہی، لادین اور یہودی نسل کے ترک مجدد کا اہم کارنامہ یہ بھی تھا کہ اس نے اسکو عجائب گھر میں تبدیل کر دیا، **(بقیہ اگلے صفحہ پر)**

جاتے ہیں کہ وہ تو ان معاہدوں کے بھی پابند نہ رہ سکے جو دستاویزی شکل میں موجود ہیں، سقوطِ غرناطہ کے وقت وہاں کی عبادت گاہوں کو باقی رکھنے اور ان کا تحفظ کرنے کا معاہدہ ہوا تھا، کیا مسیحی دنیا اور ان کے پس خوردہ لبرلس کو مسجد قرطبہ نظر نہیں آتی، ہمارے حکمرانوں نے اگر کسی شہر کو بذریعہ فتح کیا اور یہ شرط قبول کر لی کہ عبادت گاہیں علی حالہ باقی رکھی جائیں تو وہ فقہی رُو سے اس کے پابند ہو گئے اور یہ کر کے بھی دکھایا۔

جو لوگ دوسروں کے جذبات کے احترام کی دہائی دے رہے ہیں، بین مذہبی ناراضگی کے پھیلنے کا خدشہ ظاہر کر رہے ہیں ان سے کوئی پوچھے کہ پورا فلسطین چھین لیا گیا، روز فلسطینی جنازے اٹھاتے ہیں، روز ان کے گھر ڈھائے جاتے ہیں، مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی کی جاتی ہے، مقدسات کی حرمت پامال کی جاتی ہے، عراق و افغانستان کو کھنڈارات میں تبدیل کر دیا گیا تم لوگ کہاں تھے، اپنے آقاؤں کو کبھی ان پُر فریب نعروں کی تم نے دہائی کیوں نہ دی۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر اردوغان نے طاقت کے بل پر ایسا کیا تو پھر بھارت کے ہندوؤں نے یہی کام کیا تو اسے غلط کیوں کہا جائے، یہ معذور لوگ بھول گئے کہ اردوغان نے تمام قانونی کارروائی کے بعد ایسا کیا جبکہ بھارت میں بزور طاقت بھیڑ نے مسجد شہید کر دی، عدالت نے مسجد میں مورتیاں رکھے جانے کو غلط قرار دیا، اس کی شہادت کو غلط تسلیم کیا، یہ بھی تسلیم کیا کہ مسجد کو مندر توڑ کر بنائے جانے کے ثبوت نہیں ملے، یہ بھی مانا کہ قطعی طور پر یہ ثابت نہ ہو سکا کہ اس جگہ پر کوئی مندر تھا لیکن پھر بھی جگہ مندر کے لیے دے دی، جبکہ تُرک عدالت نے ثبوت و شواہد کی بنیاد پر مسجد کو بحال کیا، یہ جارحانہ و غیر دانشمندانہ فیصلہ تب ہوتا جب محض طاقت کے بل پر بغیر قانونی کارروائی (Leagal Process) کے اسے مسلمانوں کے لیے کھول دیا جاتا۔

جو لوگ سمجھتے ہیں کہ اس فیصلے کے اچھے اثرات مرتب نہیں ہوں گے ہم اسے ان کی غلط فہمی پر محمول کرتے ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ صدیوں سے دینی، فکری، علمی، معاشی اور سیاسی مغلوبیت نے ہماری دیندار اکثریت کو بھی مرعوبیت میں مبتلا کر دیا ہے، ہم باوجود مضبوط دلائل کے دوسروں کے نقطۂ نظر سے سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، عرصہ سے سیکولر دنیا اور لبرل ماحول میں زندگی گذارنے کے سبب ہم مومنانہ نظر اور قرآنی زاویہ سے چیزوں کو دیکھ نہیں پاتے، وقت، ماحول، تقاضوں اور حالات کا نہ صحیح اندازہ کر پاتے ہیں اور نہ صحیح موقف اختیار کر پاتے ہیں اور اگر سمجھ بھی لیں تو اپنی مجبوریوں کے سبب صحیح بات کا اظہار کرنے میں بھی ہم کو پسینہ آ جاتا ہے بلکہ پسینہ چھوٹ جاتا ہے، ہمیں دوسروں کی خوشنودی کا بڑا لحاظ رہتا ہے مگر ہم بھول جاتے ہیں کہ دوسرے ہمیں ''چھیل کے پھینکنے'' پر آمادہ ہیں، ہماری رواداری سے وہ کبھی نہیں خوش ہو سکتے جن کی بابت قرآن نے یہ کہہ دیا کہ وہ تم سے اس وقت تک راضی نہیں ہو سکتے جب تک تم ان کی ملت نہ اختیار کر لو ولن ترضى عنك اليهود ولا النصارى حتى تتبع ملتهم۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) عمارت کے باہر بعض ایسے اثرات نظر آئے جس سے اس کا گرجا ہونا معلوم ہوتا ہے، اندر بھی بالائی منزل پر رنگ و روغن اکھڑنے سے بعض بازنطینی دور کی تصاویر ابھر آئی ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تعمیر بازنطینی فن تعمیر کا شاہکار اور دنیا کی عظیم و قدیم عمارتوں میں سے ہے، اس وقت بھی یہ مسجد سیاحوں کی آماجگاہ ہے، بے شمار عیسائی آتے ہیں، محراب و منبر کے قریب کے حصہ میں حد بندی ہے، وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں، ہم نے بھی اس حد کے باہر کھڑے ہو کر تصویر لی، نماز بھی ادا کرنے کی اجازت نہیں ہے، اس قدیم عمارت کا مسجد میں تبدیل ہونا یورپ کو کب گوارہ لیکن وہ دن پھر جلد ہی آنے کو ہے جب بارگاہ الٰہی میں اس عمارت کے فرش پر سجدۂ شکر ادا کیا جائے گا، اس میں کوئی شک نہیں کہ ترکوں کی تعمیر کردہ مساجد اور بالخصوص سنان پاشا (۱۵۰۶ء-۱۵۹۶ء) کی تعمیر کردہ مساجد پر ایا صوفیا کی کچھ نہ کچھ چھاپ ضرور نظر آتی ہے۔

ایا صوفیا کا قضیہ نیا نہیں ہے، عدنان مندریس کی حکومت بننے کے بعد سے اس کی بازیابی کی آوازیں اٹھنے لگی تھیں، ترک اسلامی لٹریچر میں اس کا تذکرہ تھا، صدر ترکی نے اس موقع پر اپنے خطاب کو ایک ترک شاعر کی نظم کے اشعار پر ختم کیا تھا جس نے دہائیوں قبل پورے اعتماد کے ساتھ ''ایا صوفیا کی بازیابی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ ایا صوفیا تو دوبارہ فتح ہوگی، جیسے مرنے کے بعد زندہ ہونا لازمی ہے ایسے ہی تیری دوبارہ فتح لازمی ہے،'' اردوغان حکومت نے صرف مناسب وقت دیکھ کر اس قضیہ کو اختتام تک پہنچایا، اس کی بحالی کا اعلان کرنا تھا کہ عیسائی دنیا میں ماتم بپا ہوگیا، کیوں؟ اس لیے کہ وہ فتح وشکست کی علامت ہے، سنان پاشا کے تعمیر کردہ منارے یورپ کے سینوں میں نیزوں کی طرح چبھتے اور ہزیمت کے زخموں کو کریدتے ہیں، اس موقع پر ہمارا مومنانہ موقف کیا ہونا چاہیے؟

قرآن کہتا ہے: ولا یطئون موطئا یغیظ الکفار ولا ینالون من عدو نیلا الا کتب لھم من عمل صالح، ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔ (توبہ ۱۲۰)

یعنی مسلمان کافروں کے خلاف جو قدم بھی اٹھاتے ہیں جس سے ان کو غصہ آتا ہے، مسلمان ان کو جو بھی زک دیتے ہیں اس کے بدلہ ان کے لیے ایک نیک عمل لکھ دیا جاتا ہے، اللہ نیکوکاروں کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے، چنانچہ اگر یورپ کا احساسِ ہزیمت جاگا، ان کو ماضی کی شکست یاد آئی، انھیں ترکی کی خودمختاری اور مسلمانوں کی خودداری وخوداعتمادی کا احساس ہوا تو اس عمل پر ترک حکمراں ایک اجر کے مستحق قرار پائے، ان کے ناقدین سوچیں کہ ان کو کیا ملا اور وہ کس چیز کے مستحق قرار پائے، ہم شعارِ اسلام کی بحالی کو نعمت خداوندی اور فضل الٰہی تصور کرتے ہیں، ہم اسے خدا کی نصرت تصور کرتے ہیں، ایک ایسے پرآشوب عہد میں جبکہ ہر طرف غم والم کی خبریں مل رہی ہوں تو پھر ہم اظہار خوشی کیوں نہ کریں قل بفضل اللہ و برحمتہ فبذٰلك فلیفرحوا ھو خیر مما یجمعون۔ (یونس، ۵۸) اورویومئذ یفرح المومنون بنصراللہ ینصر من یشاء وھو العزیز الرحیم۔ (روم ۴-۵) حکم ہے ''کہہ دیجئے کہ ان کو اللہ کے فضل اور اس کی رحمت پر خوش ہونا چاہیے کہ وہ ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جن کو وہ جمع کرتے ہیں''، ''اور اس دن اللہ کی نصرت پر اہل ایمان خوش ہوں گے، وہ جس کی چاہے مدد کرے وہی غالب ہے اور رحم فرمانے والا ہے''۔

اب رہ گئے وہ لوگ جنھیں طاقت واختیار کے اظہار سے تکلیف ہے تو ان سے عرض کرنا ہے کہ قرآن مجید جس امت کو برپا کرنا چاہتا ہے وہ بااختیار امت ہے، صاحب اقتدار امت ہے، اسے غلبہ کی بشارت دی گئی ہے، اسے زمین میں استحکام کا مردہ سنایا گیا ہے، اسے اپنے دشمن اور دشمن خدا کو مرعوب کرنے کے لیے تیاری کا حکم دیا گیا ہے، اسے ''اعدادِ قوت'' کی تلقین کی گئی ہے، اس سلسلہ میں لفظ ''قوۃ'' کا استعمال ایسا بلیغ استعمال ہے جو قرآن کے معجزہ ہونے کے لیے کافی ہے، یعنی کسی ایک چیز کی نہیں بلکہ ہر اس چیز کی تیاری کی جائے جو اس زمانہ میں اظہار قوت کا ذریعہ ہو، قرآن تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے امر ونہی کے صیغے استعمال کرتا ہے، امر ونہی خود اپنے اندر استعلا کی خصوصیت رکھتے ہیں، یعنی جب تک کہ آدمی مقام ومرتبہ میں بلند اور طاقت و اختیار میں زیادہ نہ ہوگا آخر کیوں کر کسی کو حکم دے سکتا ہے اور کسی چیز سے روک سکتا ہے، اس لیے اس مغلوبیت ومرعوبیت اور غلامانہ فکر کا صحیح قرآنی فکر اور مومنانہ سوچ سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ فیصلہ ایک ایسے وقت میں آیا ہے جبکہ یہود ونصاریٰ غلبہ کے نشہ میں چور ہیں، القدس کو تبدیل کردینے بلکہ اس پر قبضہ مکمل

کر لینے کی پوری تیاری ہے، چنانچہ ایا صوفیا کی ایسے وقت میں اصل حیثیت بحال کرنا ایک جرأت مندانہ اور دانش مندانہ فیصلہ ہے، یہ فیصلہ ایک طاقت ور پیغام ہے، اس پیغام میں اردوغان نے صاف کر دیا ہے کہ اب ترکی برابری کی سطح پر بات کرے گا، خطہ کی کٹھ پتلی ریاستوں کی پروا کیے بغیر براہ راست عالمی طاقتوں سے بات ہوگی، اس نے عالمی سیاست میں اپنے کردار کا واضح اعلان کر دیا ہے، عربوں کو صاف پیغام دے دیا ہے کہ ترکی اب عربوں کی قیادت کے لیے تیار ہے، عالم اسلام کی سیاست ہیں اب ایرانی وسعودی فکر کا غلبہ قصہ پارینہ ہونے کو ہے، ترک سیاست کی مقبولیت مسلم ممالک کے عوام ومنکرین میں رفتہ رفتہ شباب پر پہنچ رہی ہے، عالمی اور اسلامی مواقف میں ترک سیاست بہت نمایاں نظر آرہی ہے، مسلمانوں کے لیے بشارت ہے، اس کے لیے یہ وقت انتہائی مناسب تھا، اگر چہ اس کے لیے وقتاً فوقتاً آوازیں اٹھتی رہی تھیں، کئی دہائیوں سے لوگ عدالتی چارہ جوئی کر رہے تھے، سیکولرزم کے علمبردار اگر دیگر مذاہب کی شناخت کو سیکولرزم کے سہارے عام کریں تو وہ سیکولرزم کے منافی نہیں لیکن اگر کوئی اسلامی شناخت رکھنے والا شعائر اسلامی کی بحالی کی بات کرے تو اس پر سیکولرز ماتم کرنے لگتے ہیں، یہ دراصل ان کا وہ خوف ہے جو ''اسلاموفوبیا'' کے نام سے انھوں نے گذشتہ کئی دہائیوں میں پھیلایا ہے، اردوغان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے سیکولرزم کے اتاترکی ماڈل جو خالص جبر وتشدد پر مبنی تھا۔ جس میں بھارت کے سیکولرزم کی طرح اپنی مذہبی شناخت کو بھی ظاہر کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اسی سیکولرزم کے ذریعہ کمزور کیا ہے، ان کی تمام تر حصولیابیاں اسی کے سہارے حاصل کی گئی ہیں، انھوں نے اتاترکی سیکولرزم کی محافظ فوج کو اسی کا سہارا لے کر بیرک میں واپس کیا ہے، یہی نہیں فوج کو اکسانے والے خارجی عناصر مثلاً یوروپین یونین کو بھی اس سیکولرزم کے سہارے قابو میں کیا ہے، انھوں نے فوجی انقلاب کے بعد ساری کارروائیاں اسی کے سہارے کیا ہے، اورتو اور انھوں نے نا مذہبیت کے بالمقابل مذہبی فکر کے فروغ کے لیے بھی بہت چالاکی سے اس کا استعمال کیا ہے، یہ کیا کم ہے کہ انھوں نے سماج کی سوچ بدل ڈالی، وہ ترکی جہاں اذان پر پابندی تھی، وہاں اذان کی آواز سننے بلکہ اس کے استقبال کے لیے ایا صوفیا کے باہر انسانوں کا مہذب سیلاب امڈ آیا، انھوں نے ایا صوفیا کھولنے کے لیے بھی عوام کی تحریک کا سہارا لیا، عوام نے تحریک چلائی، عدالت میں مقدمہ چلا، فیصلہ آیا، پھر انھوں نے صدارتی فرمان جاری کیا، مگر یہ سیکولر پراسیس (Secular Prosess) بھی دوغلے لوگوں کو کیسے ہضم ہوسکتا ہے، یہ معلوم رہنا چاہیے کہ ترکی کے اکثر عوام نے مذہب کو اپنے سینے سے لگا کر رکھا، جب جب موقع ملا انھوں نے اسلام پسندوں کو آگے بڑھایا یہ الگ بات کہ فوج انھیں کچل کر رکھ دیتی تھی، اردوغان نے کمال مہارت سے فوج کو عوام کی عدالت میں کھڑا کیا اور پھر موقع کا فائدہ اٹھا کر دستوری ترمیم کے ذریعہ فوج کو قابو میں کیا، آج سیکولر ہر کارے یہ تو کہتے ہیں کہ وہ اقتدار پر قابض رہنا چاہتا ہے مگر یہ نہیں بتاتے کہ عوام اسے اقتدار پر بحال رکھنا چاہتے ہیں، اس نے تمام تر دستوری ترمیمات سیکولر بنیادوں پر کی ہیں، وہ کرسی پر قابض ہے تو سیکولرسٹوں کے پیٹ میں درد کیوں ہوتا ہے جبکہ اس کے بالمقابل رجواڑوں کے راجوں مصر کے حسنی اور اب سیسی سے کبھی پریشانی نہیں ہوتی، اردوغان نے مسجد بنائی تو سیکولرسٹ چیخنے لگے دیکھو معیشت گر رہی ہے اور یہ سب سے بڑی مسجد بنا رہا ہے، یہ نہیں بتایا کہ اس نے پورے یورپ میں اپنی شناخت رکھنے والا اسپتال بھی بنایا، عوام کو علاج مفت فراہم کیا، تعلیم مفت کر دی، یہ بھی نہیں بتائیں گے کہ معیشت گرنا کیوں شروع ہوئی، ناکام فوجی انقلاب کے بعد ترک معیشت کو تباہ کرنے کے لیے امریکہ نے کیا کچھ نہیں کیا، شام کی خانہ جنگی کے ترکی پر کیا اثرات پڑے، پارلیمنٹ پہنچا دیے گئے کردوں کو اکسا کر سیکولرسٹوں نے ترکی کو کس غار میں دھکیلنے کی کوشش کی، اس کے باوجود ترکی آج بھی اس مقام پر ہے کہ کرونا کے عالمی

بحران میں امریکہ کی مدد کی ہے، سیکولرسٹوں کے سوچنے کا زاویہ ہی الگ ہے، اور ان کے فلسفوں سے استدلال کرنے والے مسلکی منافرت کے علمبردار بھی ان ہی کی راہ پر چلتے ہیں، ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ ہمارا تجزیہ مواقف ونظریات اور کارکردگی کی بنیاد پر ہوتا ہے مسلک وشخصیت پرستی کی بنیاد پر نہیں۔

ہمارے نزدیک یہ فیصلہ بالکل درست ہے، ہمیں کسی بھی مسئلہ پر انسانی نظریات نہیں بلکہ اسلامی نقطۂ نظر سے سوچنا چاہیے، ہم اردغان کے اس خطاب کا استقبال کرتے ہیں جس میں انھوں نے کہا کہ ایا صوفیا کی بحالی پوری دنیا کے مسلمانوں کے دورِ ظلمت سے نکلنے کی ابتدا ہے، ہم جانتے ہیں کہ ''ہنوز دلی دوراست'' مگر اس شخص نے عالمی فورمز پر گزشتہ چند سالوں میں اسی طرح طاقتور آوازیں بلند کی ہیں، اس نے ہر جگہ ظلم کے خلاف آواز بلند کی ہے اس نے اپنے اس خطاب میں یہ بھی کہا: ''ایا صوفیا کی بحالی صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ پوری دنیا کے مظلوموں کے لیے امید کی کرن ہے''، ہم جانتے ہیں کہ اسے جبر واستبداد کی بنیاد پر میوزیم بنایا گیا تھا، اس کو اصل ہیئت پر لانا گویا جبر واستبداد کو کھلا چیلنج ہے، اردوغان نے اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے یہ واضح کردیا کہ اب ان کی سوچ کیا ہے، آئندہ ان کا مشن کیا ہے، انھوں نے ترکی کی خودمختاری کا اعلان کیا، اپنی قوت وسطوت کا اعلان کیا، حاشیہ برداری کا انکار کیا، انھوں نے اس فیصلے کو مسلمانوں کی موجودہ مظلومیت اور ان پر حملوں کا ردقرار دیا، انھوں نے اس موقع پر جس عزم واستقلال کا اظہار کیا اور جس طرح بخاریٰ سے اندلس تک پھیلے ہوئے مسلمانوں کے تہذیبی نشانات کا حوالہ دیا وہ قابل دید اور بہت حوصلہ افزا تھا، انھوں نے صاف کہا کہ اگر مشیئت الٰہی شامل حال رہی تو ہم یقیناً اپنی منزل تک پہنچیں گے، اس خطاب کی جو سب سے خاص بات تھی اور جس سے دنیا بہت تلملائی، مذاق بنانے والے دینداروں نے بھی جس کا مذاق بنایا وہ یہ تھی کہ ''ایا صوفیا کی بحالی مسجد اقصیٰ کی فتح کا پیش خیمہ ہے''، البتہ ہمارا ایمان ہے کی مسجد اقصیٰ یہود کے پنجۂ استبداد سے آزاد ہوگی، کون کرے گا؟ کب ہوگی؟ کتنا وقت لگے گا یہ اللہ کو معلوم ہے، مگر ہم اس جملہ کی معنویت سے نہ صرف اتفاق رکھتے ہیں بلکہ اس پر یقین رکھتے ہیں، کون کہہ سکتا تھا آج سے دو دہائی قبل کہ ایا صوفیا مسجد ہوگی اور ترک اذان کا استقبال کریں گے مگر یہ ہوا، اسی طرح مسجد اقصیٰ بحال ہوکر رہے گی، مسئلہ ان لوگوں کے لیے پیدا ہوگا جو شاہان عرب کے جبہ ودستار سے آگے کچھ نہیں دیکھتے کہ وہ کہاں جائیں گے، ان کے آقاؤں نے تو صدی ڈیل میں شرکت کرکے یہ واضح کردیا کہ وہ مسجد اقصیٰ کی فتح میں نہیں شامل ہوں گے، اب فتح کون کرے گا یہ بھی اللہ کو معلوم ہے، بظاہر عالم اسلام کی قیادت پھر سے عرب سے عجم کی طرف منتقل ہورہی ہے، خیر جو بھی فتح کرے فتح تو ہوکر رہے گی، مگر جب ایسا ہوگا تو عزم واستقلال کا مذاق بنانے والے کس بل میں سمائیں گے اور کہاں منہ چھپائیں گے؟

متى نصر الله ألا إن نصر الله قريب. (بقرہ ٢١٤)

☆☆☆

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی)

❑ قند مکرر

عید قرباں کا پیغام

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

عیدالاضحیٰ آتی ہے اور گذر جاتی ہے، اس بار بھی آئی اور گذر گئی، کچھ خوش نصیب لوگوں نے اس کے لئے بڑا اہتمام کیا ہوگا، کچھ لبرل لوگوں کے لئے یہ ایک رسم رہی ہوگی جو ادا ہوگئی، کچھ کو اس کی تاریخ سے واقفیت رہی ہوگی، اس لیے انھوں نے بڑے خلوص و جذبۂ شکر کے ساتھ قربانی پیش کی ہوگی، کچھ نے گوشت کھانے کے لئے ہی قربانی کی ہوگی، مگر کی تو ہوگی خواہ دکھانے کے لئے ہی کی ہو، جی ہاں! کچھ بے چارے کئی کئی جانور قربان کرتے ہیں اور تعداد مع قیمت خوب بیان کرتے ہیں مگر ان کے غریب اعزہ و اقربا ایک ایک بوٹی کو ترستے ہیں، خیر اب تو نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ کچھ لبرل قربانی کو ہی بے سود اور فضول سمجھنے لگے ہیں، ان کی نظر میں اس قدر خون بہانے سے بہتر ہے کہ یہ رقم صدقہ کی جائے، تعلیم پر خرچ کی جائے اور دوسرے قومی و رفاہی کام کیے جائیں، ظاہر ہے کہ یہ بے چارے عقل مند بلکہ عقل کے مارے جس طرح قربانی کے سماجی و اقتصادی فوائد اور رفاہی پہلو سے واقف نہیں اسی طرح ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ قربانی کے دنوں میں اللہ کو خون بہانے سے زیادہ کوئی اور عمل پسند ہی نہیں، حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے: عن عائشةؓ أن رسول اللہ ﷺ قال: ما عمل آدميّ من عمل يوم النحر أحب إلى الله من إهراق الدم، إنه ليأتي يوم القيامة بقرونها وأشعارها وأظلافها وإن الدم ليقع من الله بمكان قبل أن يقع من الأرض، فطيبوا بها نفساً (رواہ الترمذی، ۱۴۹۳، أبواب الأضاحی) (ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے ارشاد فرمایا: یوم النحر کو ابن آدم کا کوئی بھی عمل خون بہانے سے زیادہ اللہ کے نزدیک محبوب نہیں، اور قربانی کا جانور اپنے سینگ، کھر، اور بالوں کے ساتھ قیامت کے دن آئے گا، اور بے شک وہ خون کے زمین پر گرنے سے پہلے اللہ کے یہاں مرتبہ حاصل کر لیتا ہے، پس اس کو خوش دلی سے انجام دو)۔

حقیقت میں یہ قربانی بندے کے لئے اللہ سے تعلق کے اظہار کا ذریعہ اور اس کی علامت ہے، اس کے خون اور گوشت سے خدا کو کوئی سروکار نہیں، اس کی بارگاہ میں تو وہی تعلق، وہی اخلاص اور وہی نیت پہنچتی ہے جس کے اظہار کے لیے یہ قربانی پیش کی جاتی ہے، اسی کا ارشاد ہے لن ينال الله لحومها ولا دماء ها ولكن يناله التقوى منكم (حج: ۳۷) (ترجمہ: اللہ تک ان جانوروں کا نہ خون پہونچتا ہے اور نہ گوشت، اللہ تک تو تمہارا تقوی پہونچتا ہے (اللہ کے

یہاں تمہارے خلوص اور تقوی کی اصل قدر ہے)۔

یہ قربانی ایک ایسے قرآنی قصہ کی یادگار ہے جو امتحان وآزمائش کی اعلیٰ ترین مثال ہے، اس میں حکم الٰہی کے سامنے دو نبیوں کے سرِ تسلیم خم کرنے کی ایسی مثال بیان کی گئی ہے، ان کے صبر واستقامت اور طاعت الٰہی کا ایسا واقعہ سنایا گیا ہے جو خالق کائنات کو کچھ اس طرح بھایا کہ اسے رہتی دنیا تک کے لیے یادگار بنا دیا، امت اسلامیہ کے ایک فرد کی حیثیت سے ضروری ہے کہ اپنے جد امجد حضرت ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام کے اس واقعہ سے واقفیت حاصل کی جائے، ملت ابراہیمی کی طرف نسبت ہے تو اس نسبت کی اہمیت کو سمجھا جائے، یہ قربانی بھی تو ملت ابراہیمی کا شعار ہے، اسی ملت ابراہیمی کی اتباع کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب حضرت محمدؐ کو حکم دیا تھا ثم اوحينا إليك أن اتبع ملة ابراهيم حنيفا وما كان من المشركين (النحل:۱۲۳) (ترجمہ: پھر ہم نے تمہیں پیغام دیا کہ اللہ کے لئے یکسو ہوکر ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو، اوران کی طرز حیات کو اختیار کرو، وہ شرک کرنے والے نہیں تھے)، اس ملت ابراہیمی سے اعراض کرنے والے کو اللہ تعالیٰ نے احمق وبے وقوف قرار دیا تھا، ومن يرغب عن ملة إبراهيم إلا من سفه نفسه ولقد اصطفيناه فى الدنيا وإنه فى الآخرة لمن الصالحين (بقرہ:۱۳۰) (ترجمہ: ابراہیم کی ملت اور ان کے طور وطریق سے اعراض کرنے والا وہی ہوسکتا ہے جو خود اپنے تئیں احمق وسفیہ ہو، ہم نے دنیا میں ان کا انتخاب کیا، اور آخرت میں وہ ان لوگوں میں ہوں گے، جنہوں نے بالکل درست روش اختیار کی)۔، اسی ملت ابراہیمی کے اتباع کو اللہ نے حسن اسلام اور غایتِ تدین کی علامت بنایا تھا ومن احسن دينا ممن أسلم وجهه لله وهو محسن واتبع ملة ابراهيم حنيفا وماكان من المشركين (نساء:۱۲۵)، (ترجمہ: اس سے بڑھ کر بہتر دینداری کس کی ہے؟ جو اپنے کو نیکوکاری کے ساتھ اللہ کے حوالہ کردے، اور ملت ابراہیمی کا اتباع کرے، جو اللہ کے لئے یکسو تھے، اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا خلیل (اپنا محبّ ومحبوب) بنایا)۔ اسی ملت ابراہیمی کی طرف اللہ نے اپنے نبی کو ہدایت دی تھی قل إننى هدانى ربى الى صراط مستقيم دينا قيما ملة ابراهيم حنيفا وما كان من المشركين (انعام:۱۶۱) (ترجمہ: کہہ دیجئے کہ میرے رب نے صحیح راستے کی طرف میری رہنمائی کی ہے، صحیح دین، صحیح نظام اطاعت اور ملت ابراہیمی کی جو مکمل طور پر اللہ کے لئے یکسو تھے، اور وہ شرک کرنے والے نہیں تھے)، اسی ملت ابراہیمی کے اتباع کا سب کو حکم دیا تھا قل صدق الله فاتبعوا ملة ابراهيم حنيفا وما كان من المشركين (ال عمران:۹۵) (ترجمہ: کہہ دیجئے کہ اللہ نے سچ کہا؛ ابراہیم کی ملت کا اتباع کرو، وہ اللہ کے لئے یکسو تھے، وہ مشرکوں میں سے نہیں تھے)۔ چنانچہ جب یہ قربانی اس ملت ابراہیمی کا شعار ہے تو پھر لازم ہے کہ اس کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کی جائے، اور یہ بھی نہ ہو کہ قربانی تو کی جائے مگر اس کے مقاصد، اس سے حاصل ہونے والے سبق کو فراموش کر دیا جائے، خود عید کے مقاصد سے ہی نابلد رہا جائے، قربانی تو کی جائے مگر قربانی کے علاوہ بقیہ شعبہائے زندگی میں ملت ابراہیمی کے اتباع کو بالائے طاق رکھ دیا جائے اور موقف ابراہیمی

کے خلاف زندگی گذاری جائے، شعائر اسلامی کی پامالی پر دل بھی نہ دکھے، زبان سے آہ بھی نہ نکلے، کفر وشرک سے اظہار براء ت اس کے غلبہ اور اس کی ہمنوائی کرنے والوں کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت بھی نہ ہوسکے، ملت ابراہیمی سے نسبت کا تقاضا ہے کہ حضرت ابراہیم کا وہ کردار جو ایثار، جرأت، حکمت: بے باکی وحق گوئی اور ببانگ دہل توحید باری کے اعلان سے عبارت ہے ہمارے سامنے ہو۔

عید درحقیقت اسلام میں اجتماعیت اور اسلامی تشخص کی علامت اور مظہر ہے، مسلمانوں کی عید ان کو دوسری قوموں سے ممتاز کرتی ہے، وہ ایک عید بطور شکرانۂ الٰہی مناتے ہیں تو دوسری عید میں بارگاہ الٰہی میں قربانیوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں، انھیں اس کی قطعاً اجازت نہیں کہ وہ عید کی خوشی میں حدود شریعت سے باہر نکل جائیں، فسق و فجور کی محفلیں سجائیں، جوئے اور ناچ گانے میں مست ہوجائیں، لباس، خوشی اور عید کی پارٹی کے نام پر بے حیائی، فحاشی اور مغربی تہذیب کی نقالی سے عید کے تشخص کو برباد کردیں، کیوں کہ ان کی عید دوسروں کی عید سے ممتاز، مغائر، ممیّز، پاکیزہ، سنجیدہ و باوقار اور بہت بہتر ہے، جیسا کہ خود نبی کریمؐ نے اہل مدینہ سے فرمایا تھا کہ تمہارے یہ جو دو دن کھیل کود کے لیے مختص ہیں، ان کو اللہ نے یوم الفطر اور یوم الاضحیٰ سے تبدیل کردیا ہے جو ان دونوں سے بہتر ہیں، "قدم رسول اللہ ﷺ المدينة ولهم يومان يلعبون فيهما، فقال: ما هذان اليومان؟ قالوا: كنا نلعب فيهما في الجاهلية، فقال رسول اللہ ﷺ إن الله قد أبدلكم بهما خيرا منهما يوم الاضحى ويوم الفطر۔

اس حیثیت سے یہ بات سمجھنا چاہیے کہ مسلمانوں کی عید دین کا مظہر ہے، دین کا شعار ہے، اس کی تعظیم و احترام لازم ہے، عید میں بھی شعائر دین کی تعظیم کا لحاظ رکھنے، اجتماعی بنیادوں کو استوار کرنے اور اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ عید درحقیقت اپنے دینی تصور کے اعتبار سے محض شکرانۂ نعمت اور شکر الٰہی کا مظہر ہے ولتكملوا العدة ولتكبروا الله على ما هداكم ولعلكم تشكرون (بقرہ:۱۸۵) (ترجمہ: اور یہ مقصود ہے کہ تم روزوں کی تعداد پوری کرو، اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو ہدایت دی ہے اس پر عظمت و کبریائی کے گن گاؤ اور تاکہ تم (اس کی نوازشوں کا) شکر ادا کرو)۔

عید کے اجتماعی، معاشرتی اور انسانی پہلو کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے، بچوں کو عید کا انتظار رہتا ہے، عید کی آمد سے وہ کھل اٹھتے ہیں، یہ درحقیقت ان کی خوشی کا دن ہوتا ہے، فقراء ومساکین عید کا انتظار کرتے ہیں، ان کو اصحاب ثروت کی طرف سے کچھ مدد مل جاتی ہے، اب اگر بڑے بچوں کی خوشی کا لحاظ نہ کریں، اغنیاء وفقراء کی طرف توجہ نہ کریں تو گویا عید کا یہ پہلو ان کے سامنے نہیں تھا یا پھر عید کا یہ سبق وہ بھول گئے، عید اتفاق و اتحاد پیدا کرنے، ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے، رشتوں کی شیرازہ بندی کرنے، عفوودرگذر کا مظاہرہ کرنے، بغض وحسد سے نجات پانے اور نفرتوں کو الفتوں میں تبدیل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، عید کی انسانی اور اجتماعی حیثیت اس ناحیہ سے بہت اہم ہے، کہ عید کے دن اغنیاء طبقہ وخیرات، ہدایا وتحائف اور قربانی کے گوشت کے ذریعہ اپنے اموال سے فقراء کو دینے کا سبق یاد کریں، معاشرے کے کمزوروں پر شفقت ومحبت ورحمت کی نگاہ ڈالیں اور کیا خوب ہو کہ مالدار کمزوروں کے ساتھ اس طرح پیش آئیں

جیسے اللہ نے ان پر نوازشات کی بارش کی ہے، جیسے اللہ نے ان کو دولت سے مالا مال کیا ہے، نعمتوں سے نہال کیا ہے، اللہ نے اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: أحسن كما أحسن الله إليك ولا تبغى الفساد فى الارض إن الله لا يحب المفسدين (سورہ قصص: ۷۷) (ترجمہ: اچھا معاملہ کرو جیسے اللہ نے تمہارے ساتھ اچھا معاملہ کر رکھا ہے اور زمین میں بگاڑ نہ پیدا کرو، اور اللہ تعالیٰ فساد اور بگاڑ پیدا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)۔ اگر عید کے اس انسانی پہلو کو عمل میں لایا جائے تو عید کی خوشی سے ہر گھر سرشار ہوگا، ہر خاندان عید کا لطف لے گا اور اس طرح اسلامی عبادات کا انسانی واجتماعی پہلو غیروں کے سامنے آکر ان کے لیے باعث کشش اور خاموش دعوت ہوگا۔

عید پر اس پہلو سے بھی غور کیجئے، قرآن مجید کا بیان ہے إن هذه امتكم امة واحدة وأنا ربكم فاعبدون (انبیاء:۹۲) (ترجمہ: یہ تمہاری امت ایک امت ہے، اور میں تمہارا رب ہوں، پس میری بندگی کرو)۔ ذرا دیکھیے کہ عید کے دن پوری امت مسلمہ کس طرح امت واحدہ ہونے کا شعوری یا غیر شعوری طور پر پیغام دیتی ہے، کس طرح سب ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں، گِلے شکوے دور کرتے ہیں، ایک دوسرے کو کثرت سے ہدایا دیتے ہیں، اس موقع پر بسا اوقات ہدایا کا تبادلہ کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ اپنی ہی چیز گھوم پھر کر واپس آجاتی ہے، اخلاص کی جس قدر فضیلت آئی ہے اس کی مٹھاس بڑی حد تک اس دن محسوس ہوتی ہے، یوں تو بے شمار فضیلتوں کے باوجود پڑوسیوں کے حقوق پر توجہ نہیں دی جاتی مگر عید کے دن پڑوسیت کی حِس بھی جاگ جاتی ہے، یہ الگ بات کہ بعض بدنصیب شہر ایسے بھی ہیں جہاں مسلمان اس دن بھی سات دروازوں میں کنڈی لگا کر گھر کے دربے میں بند رہتے ہیں، اس قدر اندر بیٹھ کر وہ دوسروں سے ملنے کے بجائے لوگوں کی آمد کا انتظار کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ اگر عید کے اس پہلو پر شعوری طور پر عمل کیا جائے تو پوری امت انعام الٰہی کا مصداق ٹھہرے گی، کیوں کہ سب کے سب امت کی اجتماعیت کو قائم کرنے میں اپنا حصہ ڈالیں گے، افراد ملت میں اجتماعیت کا احساس پیدا کرنے میں اپنا کردار ادا کریں گے إنما المؤمنون اخوة کی تعبیر وتفسیر عملا پیش کرنے کی کوشش میں شامل ہوں گے، اگر یہ کام کیا جائے اور شعوری طور پر کیا جائے تو یہ بڑے پیمانے پر اصلاح ذات البین کا بھی ذریعہ بن سکتا ہے، معاشرے میں اخوت ومحبت کی جڑیں مضبوط کر سکتا ہے اور بڑے پیمانے پر مؤثر انداز میں اس پیغام کو اس طرح عام کیا جاسکتا ہے، انما المؤمنون اخوة فاصلحوا بين اخويكم واتقوا الله لعلكم ترحمون (الحجرات: (۱۰) (ترجمہ: تمام ایمان والے بھائی بھائی ہیں، اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرایا کرو، اور اللہ کا لحاظ رکھا کرو (اس کی شریعت کی پابندی کیا کرو) تاکہ تم پر وہ رحم فرمائے۔

جب اخوت اسلامی کا یہ احساس پیدا کیا جائے گا تو پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ دوسروں کے درد کو محسوس کریں گے، دوسروں کی تکلیف سے انھیں تکلیف محسوس ہوگی، پھر وہ خود کو فرد ملت سمجھیں گے اور ملت پر ٹوٹنے والے آلام ومصائب کو عید کی خوشی اور دعوتوں کی لذت اور کباب وقورمہ کی کشش میں فراموش نہیں کریں گے، اس امت کو اللہ نے خیر امت بنایا ہے، امت وسط بنایا ہے،

اس لیے اس کے ہر کام میں خیر نمایاں اور اعتدال کا اظہار ہونا ضروری ہے، اس امت کے اہل ایمان کی خصوصیت جناب رسالت مآب ﷺ نے یوں بیان فرمائی ہے مثل المؤمنین فی توادھم وتراحمھم وتعاطفھم کمثل الجسد الواحد، إذا اشتکی منه عضو واحد تداعی له سائر الجسد بالسھر والحمی (مسند احمد/۱۸۳۷۳، الطبعۃ الاولی ۱۹۹۹ء) (ترجمہ: آپسی محبت و ہمدردی اور شفقت میں مؤمنین کی مثال ایک جسم کی طرح ہے، کہ جب جسم کے کسی ایک عضو کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو پورا بدن بے خوابی اور بخار کا شکار ہوتا ہے) اس امت کے خیر امت اور امت وسط ہونے کے اعتبار سے لازم ہے کہ خوشی وغمی، تنگ حالی و خوش حالی، مصیبت و فرحت کا کوئی موقع ہو مگر اس کا اعتدال نمایاں ہو کر سامنے آئے، ایک طرف اگر عید کے موقع پر عید کی خوشیوں سے لطف اندوز ہو تو دوسری طرف محروم دنیا کو خوشی میں شریک کرے، اور نظر فلسطین وشام اور دیگر مسلم ممالک کے مظلوم ومقہور و بے بس مسلمانوں کی محرومی پر رکھے اور زبان سے ان کے لیے دعا کرے کہ اللہ ان کے مصائب دور کر دے اور آئندہ عید ہماری طرح ان کے لیے بھی خوشیوں بھرا پیغام لے کر آئے۔

عیدیں آتی ہیں گذر جاتی ہیں، اسی طرح اس مرتبہ بھی عید قرباں آئی اور گذر گئی، مگر سوچنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہم نے اس کے پیغام کو سمجھا، کیا عید ہمارے لیے شعور کی بیداری، جذبۂ اخوت ومحبت کو جنم دینے کا ذریعہ بنی، کیا ہماری عید اس طرح مظہر اعتدال ووسطیت بن سکی کہ ہم اپنی خوشی کا اظہار بھی کریں اور دوسرے بھائیوں پر مظالم ومصائب کو بھی محسوس کر سکیں، کیا ہم نے معاشرے کے کمزوروں کو اپنے دسترخوان پر بلایا، کیا ہم ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ان سے ملنے گئے، کیا ہم نے غریبوں کی مدد کی، ان کے گھر بھی اچھا کھانا پک جائے، اس کی فکر کی، گھر کے نوکر کے بچے بھی نئے کپڑے پہن لیں اور ہمارے بچوں کی طرح خوشی منالیں، یہ احساس جاگا، کیا ہمارے اندر ابراہیم واسمعیل علیہما السلام کی ملت کے اتباع کا احساس جاگا، کیا ان کے صبر واطاعت و استقامت اور راہ خدا میں حکم الٰہی کے سامنے اپنی ہر چیز قربان کر دینے کے واقعہ سے ہمارے اندر بھی اطاعت و استقامت کا کچھ جذبہ پیدا ہوا، یا یہ عید بھی گوشت کھانے پکانے اور قربانی کے جانور کے محفل در محفل تذکرے کرنے میں گزر گئی، اگر اب تک ہم نے غور نہیں کیا ہے، قربانی کی حقیقت، عید کے پیغام محبت و اجتماعیت اور اس کے معاشرتی وانسانی پہلو کو نہیں سمجھ سکے ہیں تو پھر ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ آئندہ عید آنے سے قبل ہم اپنے اور اپنے اہل خانہ کے اندر یہ روح پیدا کر لیں، تاکہ آئندہ ہماری صحیح معنی میں عید ہو سکے اور ہم انفرادی طور پر عبادت کرنے کے ساتھ ساتھ اجتماعی احساس کو فروغ دینے اور مقاصد عید کو عام کرنے کا ذریعہ بن جائیں۔

☆☆☆

یہ دور اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ

❑ اسلامی تعلیمات

بیماری اور بیمار پرسی کے آداب

حافظ کلیم اللہ عمری مدنی
استاذ و مفتی جامعہ دارالسلام، عمرآباد

اللہ تعالی کا ہر حال میں شکر بجالانا ایمان کی علامت ہے۔ ایمان درحقیقت دو ہی چیزوں سے مرکب ہے، یعنی صبر اور شکر۔ مومن ہر حال میں فائدہ ہی میں رہتا ہے، خوشحالی کے موقع پر رب کا شاکر بندہ بن کر اسی کی رضا اور انعام کو پالیتا ہے۔ مصائب، رنج وغم، بیماری، آفات ارضی وسماوی کی صورت میں رب کے فیصلے کے سامنے صبر ورضا کا پیکر بن کر زندگی گزارنے کے لئے ٹھوس پہاڑ بن جاتا ہے۔ یہی ایمانی کیفیت بندہ سے ہمہ وقت مطلوب ہے۔ اس کی بے شمار مثالیں قرآن کریم میں متعدد مقامات پر بیان کی گئیں ہیں۔

اللہ تعالی انسان کو آزمانے کے لئے مختلف مراحل اور کچھ نامساعد حالات سے دوچار کردیتا ہے، مثال کے طور پر بیماری یہ ایک حالت ہے، جو کبھی وقتی تو کبھی دائمی ہوا کرتی ہے۔ بیماری دو طرح کی ہوا کرتی ہے، یعنی متعدی اور غیر متعدی۔ وبائی امراض بسا اوقات متعدی بھی ہو سکتے ہیں۔ ہر چیز اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ موجودہ دور میں کرونا وائرس بھی بندوں کے لئے قدرت الٰہی کی جانب سے ایک ابتلاء اور امتحان ہے۔ احتیاطی تدابیر اختیار کرنا اور اسباب مرض سے دور رہنا بھی شریعت ہی کی تعلیم ہے، اور اپنے آپ کو مرض سے بچانا یعنی جہاں مرض پھیل رہا ہو وہاں کے لوگوں کا باہر کی طرف ہجرت نہ کرنا اور باہر کے لوگوں کا ان مقامات کا قصد نہ کرنا بھی احتیاطی تدابیر میں شامل ہے۔ یہ شریعت کے اصول وآداب ہیں، اور ملکی قانون بھی جو شریعت کے خلاف نہ ہو، اس کی تابعداری کرنا ہر مسلمان اور ہر معزز شہری پر لازم ہے۔ یہ حالت بیماری بھی ایک نعمت ہے۔ اگر کوئی انسان صداصحت مند رہے تو شاید وقت کا بڑا باغی اور بڑا مغرور بن جائے،، اور اس کی یہ حالت ہوگی کہ کبھی کسی مریض پر رحم وکرم کی نظر نہ ڈالے، کسی بیمار پر کبھی ترس نہ کھائے۔ اسی لئے اللہ تعالی ملکی سطح پر یا بیرون ملک میں بھی بیک وقت اس طرح کے حالات سے دوچار کردیتا ہے، مگر بندہ مومن اس سے سبق حاصل کرتا ہے۔

موجودہ حالات میں نمازیوں کو بھی احتیاطی تدابیر کے تحت اپنے اپنے گھروں کو نماز کے ذریعہ آباد کرنا وقت کا عین تقاضا ہے، بلکہ سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ گھر کے ذمہ دار/سرپرست افراد کو چاہیے کہ وہ باجماعت نماز کا اہتمام کریں، تاکہ خواتین کو بھی نماز باجماعت کے ثواب میں شامل کیا جائے۔

نوٹ۔ باجماعت نماز قائم کرنے سے قبل (احتیاطا آہستہ آواز

میں)اذان دینا بھی سنت ہے۔

(اذا حضرت الصلاۃ فأذنا و أقیما ثم لیؤمکما أکبر کما،البخاری. ۶۲۷)

نیز ایمرجنسی حالات میں لوگ اپنے اپنے گھروں میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ نماز جمعہ قائم کرنا چاہیں تو شرعاً اجازت ہے ، کوئی ممانعت نہیں ہے ؛ لیکن پڑوسیوں کو جمع کرکے نماز جمعہ قائم کرنا قانون شکنی کے مترادف ہے لہذا قانون کا احترام کرنا بھی ہر معزز شہری پر ضروری ہے۔

بیماری بھی ایک نعمت ہے:

۱۔مومن کی زندگی میں مصائب وآلام جس قدر بھی سخت سے سخت ہوجائیں ،لیکن مشکل کے بعد ہر حال میں آسانی کا آنا یقینی چیز ہے ،جس طرح رات کے بعد صبح کا نمودار ہونا برحق ہے، دنیا کا عذاب ،مشقتیں ،آخرت کے بالمقابل معمولی ہیں، اور قابل برداشت ہیں۔

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: تم میں سے کسی کی موت ہرگز نہ آئے مگر یہ کہ وہ اللہ تعالی سے حسن ظن رکھتا ہو، (رواہ مسلم/ ۲۸۷۷)

۲۔بیمار قابل رحم ہے ۔آج کے دور میں صحت مند انسان ایک بیمار سے بدکتا ہے،نفرت کرتا ہے،اس سے دور رہنے کی پوری کوشش کرتا ہے، حالانکہ وہ دلی ہمدردی کا مستحق ہے، جب کہ عیسائی مشنریوں کے لوگ اس سلسلہ میں اپنا فرض سمجھ کر ہر بیمار کی تیمارداری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ، اس خدمت کے ذریعہ اپنے مذہب کی تبلیغ بھی کرلیتے ہیں ، حالانکہ اسلام نے ایسے موقع پر یہ حکم دیا کہ کسی بیمار سے نفرت نہ کرو، بلکہ تیمارداری کرنا عبادت ہے، تیماردار کے لئے (رحمت کے)۷۰ ہزار فرشتے مغفرت طلب کرتے ہیں۔

آخری صورت یہ بھی ہے کہ مصیبت زدہ انسان کو دیکھ کر اتنی دعا ضرور کی جائے تا کہ اللہ ہمیں عافیت میں رکھے ، الحمد للہ الذی عافانی مماابتلاک بہ وفضلنی علی کثیر ممن خلق تفضیلا ،یعنی ہر قسم کی تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے مجھے اس مرض سے محفوظ رکھا، جس مرض میں تجھے مبتلا کیا ، اور مجھے بہت سی مخلوقات پر بطور خاص افضلیت دی ہے۔

۳۔آب زمزم کی فضیلت: اللہ تعالی نے اپنے خاص فضل سے بندوں کے لئے تا قیامت ایک مبارک پانی کا انتظام فرمایا ہے جو حقیقت میں ہر مریض کے لئے باعث شفاء ہے۔ ہر مومن کی نیک مرادیں اس سے حاصل ہوتی ہیں، لہذا مریض اس متبرک پانی کا استعمال ضرور کرے۔بعض حجاج اس پانی سے احرام کے کپڑے وغیرہ دھوتے ہیں، جو حقیقت میں اس کی نا قدری ہے۔اس پانی کو پینے کے لئے استعمال کیا جائے، بطور دواء، بھوک مٹانے ، پیاس بجھانے ، اور دنیوی مصائب وآلام سے راحت پینے کی خاطر استعمال کی جائے ، ان شاء اللہ نیک تمنائیں ضرور پوری ہوں گی۔

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ آب زمزم جس ارادہ سے پیا جائے وہ ارادہ پورا ہوتا ہے (ابن ماجہ۔۳۰۶۲،صحیح)اور مسلم کی روایت میں ہے: یہ مبارک پانی اور غذا بخش خوراک ہے۔ (مسلم،۲۴۷۳)

آب زمزم بیماری کے لئے شفاء ہے۔

(السلسلۃ الصحیحۃ : ۱۰۵۶)

زمزم پینے کے لئے کوئی خاص دعا ثابت نہیں ہے مگر ابن عباسؓ یہ دعا اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ أَسْأَلُکَ عِلْمًا نَافِعًا وَرِزْقًا وَاسِعًا وَشِفَاءً مِنْ کُلِّ دَاء (حاکم:۱/۴۷۳) پڑھا کرتے تھے، ترجمہ: اے اللہ میں تجھ سے نفع بخش علم ،

کشادہ روزی اور ہر بیماری سے شفاء مانگتا ہوں۔

۴۔ بیماری میں اللہ نے حج جیسی اہم عبادت کے موقع پر بڑی رخصتیں رکھی ہیں، جو اس دین کی امتیازی شان ہے، مثلاً حجاج کرام کے لئے مزدلفہ میں رات گذارنا حج کی اہم عبادتوں میں سے ہے، یہاں تک کہ صبح نمودار ہوجائے؛ البتہ ضعیفوں، بیماروں، اور ان کے خدمت گذاروں کے لئے آدھی رات گذارنے کے بعد منی جانے کی رخصت دی گئی ہے۔ نماز میں جو کھڑے ہوکر نماز نہ پڑھ سکے، بیٹھ کر یا کرسی پر یا لیٹ کر جس حالت میں بھی مریض عبادت کرسکتا ہو، اسے اجازت ہے۔ روزوں میں قضا کی اجازت، حج نہ کرسکے تو مریض کسی کو اپنا نائب بنائے، وضوء نہ کرسکے، تو تیمّم کرلے۔ اور اس طرح کی بہت سی رخصتیں ہیں۔ البتہ شرعی رخصتوں پر عمل ضرورۃً ہی ہونا چاہیے۔ الحمدللہ علی کل حال۔

۵۔ بیماری اگر نہ ہوتی تو انسان صحت کی قدر و قیمت نہ جانتا، اسی لئے اللہ نے ہر انسان، خواہ وہ نیک ہو یا بد کسی نہ کسی بیماری سے دوچار کر رکھا ہے، کسی کا مرض ظاہر ہے تو کسی کا مخفی، لیکن آزمائش کا سلسلہ جاری وساری ہے،، بیماری کا فائدہ یہ بھی ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''مومن کو خواہ ارنج ملے یا جسمانی تکلیف لاحق ہو، یا بیماری میں مبتلا ہو، حتی کہ وہ جس غم بھی مبتلا ہو، اس کی وجہ سے بھی اس کے بہت سارے گناہ معاف کردئے جاتے ہیں۔ (مسلم حدیث نمبر ۲۵۷۳)

اور یہ بھی فرمان نبوت ہے: '' مومن مرد و مومن عورت کی زندگی میں آزمائشوں کا سلسلہ چلتا رہتا ہے، کبھی اس کی جان میں، تو کبھی اس کی آل واولاد میں، یہاں تک کہ مومن اللہ سے اس حال میں ملتا ہے کہ اس پر کوئی قابل گرفت گناہ نہیں ہوتا''۔ (ترمذی، ۲۳۹۹، السلسلۃ الصحیحۃ، برقم ۲۲۸۰)

یعنی امراض بھی گناہوں کے لئے کفارہ بن جاتے ہیں۔

۶۔ بعض اسلاف سے منقول ہے۔ **لولا مصائب الدنیا لوردنا القیامۃ مفالیس** (صفوۃ الصفوۃ ۴/ ۳۸) یعنی اگر دنیا کی مصیبتیں و مشقتیں نہ ہوتیں تو ہم قیامت کے دن مفلس بن کر حاضر ہوتے۔

۷۔ **تندرستی ہزار نعمت ہے:** صحت کی قیمت جاننے کے لئے صحت مند آدمی بیماروں، مصیبت زدہ لوگوں اور اعضاء و جوارح سے محروم لوگوں یا جسمانی نقص کے ساتھ جینے والے حضرات کی طرف ایک نظرِ عبرت دوڑائے تو اس وقت اسے اللہ کی نعمت کا اندازہ ہوگا۔ کتنے لوگ ایسے ہیں جو قوت بصارت سے محروم، قوت سماعت سے محروم، چلنے پھرنے سے معذور اور کتنے ایسے ہیں کہ نیند سے محروم ہیں، مگر اللہ نے ہمیں یہ ساری نعمتیں مکمل طور پر عطا کی ہیں۔ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ ساری تعریف اور شکر اللہ ہی کے لئے ہے۔

حضرت یونس بن عبید رحمہ اللہ سے ایک شخص نے تنگ دستی کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا: کیا تجھے یہ پسند ہے کہ تیری ان آنکھوں کے عوض ایک لاکھ درھم ملے؟ اس نے کہا، نہیں۔ آپ نے پوچھا کہ کیا تجھے یہ پسند ہے کہ تیرے ہاتھوں کے عوض ایک لاکھ درہم دیا جائے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں، پھر آپ نے پوچھا کہ تیرے پیروں کے بدلے ایک لاکھ درہم دیا جائے؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ تو آپ نے اس سے کہا کہ اللہ کی نعمتوں کو یاد کر کے اس کا شکر ادا کر، اور فرمایا کہ تیرے پاس لاکھوں کی دولت ہے تو پھر بھی تنگ دستی کی شکایت کرتا ہے؟

۸۔ بیماری کے حقیقی فائدے تو آخرت میں معلوم ہوں گے۔ بظاہر مومن کے لئے یہ دنیا قید خانہ ہے، اور کافر کے لئے جنت ہی جنت ہے۔ بعض حدیثوں سے ثابت ہے کہ لوگ قیامت کے دن تمنا کریں گے کہ کاش ان کی کھالیں دنیا میں ادھیڑ دی

جاتیں، یا نکال دی جاتیں تو کیا ہی اچھا ہوتا، کیوں کہ وہ دیکھیں گے کہ دنیا میں مشقتیں جھیلنے والے اللہ تعالی کے پاس بہتر سے بہتر بدلہ پا رہے ہوں گے۔ ترمذی، ۲۴۲۰، صحیح الجامع، ۵۴۸۴)

۹۔ بیماری کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ بھی نعمت غیر مترقبہ ہے، جیسا کہ ایک حدیث قدسی ہے، اللہ کا فرمان ہے، اے آدم کی اولاد! میرا فلان بندہ بیمار ہوا تو تو نے اس کی عیادت نہ کی، اگر تو اس کی بیمار پرسی کرتا تو تو مجھے وہاں پالیتا۔ (مسلم، ۲۵۶۹)

۱۰۔ بیماری کے ذریعہ مومن کے صبر کا امتحان لیا جاتا ہے، جیسا کہ ارشاد نبوی ہے کہ آزمائش کے حساب سے بڑا بدلہ دیا جاتا ہے، اور اللہ تعالی جب کسی قوم سے محبت کرتا تو اسے آماتا ہے۔ جو اس ابتلاء سے راضی ہو جائے اس کے لیے رضامندی لکھ دی جاتی ہے اور جو اس ابتلاء کو ناپسند کرے تو اس کے لیے ناراضی لکھ دی جاتی ہے۔ (ترمذی، ۲۳۹۶)

۱۱۔ حضرت فضیلؒ نے فرمایا ہے کہ جب اللہ تعالی کسی بندہ سے محبت فرماتا ہے تو اس پر رنج وغم کی کثرت فرماتا ہے اور جب کسی بندہ کو ناپسند کرتا ہے تو اس پر اس کی دنیا وسیع کر دیتا ہے۔ (حلیۃ الاولیاء ۸/ ۸۸)

۱۲۔ بیماری کے فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ بندہ راحت کے انتظار میں جو وقت گزارتا ہے درحقیقت وہ بھی ایک اہم عبادت ہے، خصوصا دنیا اور دنیا کے سارے اطباء اور مخلصین سے بندہ ناامید ومایوس ہو جاتا ہے تو اس کے لئے صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے: وہ ہے غیب کا راستہ، اللہ جل جلالہ کی شان وعظمت کا راستہ، تعلق باللہ کا راستہ، خواہ وہ مرض سرطان یعنی کینسر کا ہی کیوں نہ ہو، اللہ تعالی کی ذات ہی ہے جو ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہے، محال کو ممکن سے بدل دیتی ہے۔ سچ فرمایا ہے اللہ تعالی نے **حتی اذا استیأس الرسل وظنوا أنهم قد كذبوا جاء هم نصرنا** (سورۃ یوسف، ۱۱۰) یعنی جب رسول مایوس ہو گئے، اور انہوں نے گمان کر لیا کہ وہ جھٹلائے گئے ہیں تو ان کے پاس ہماری مدد آ پہنچی۔

۱۳۔ بیماری کا آنا بھی اللہ کی طرف سے خیر کی علامت ہے، جیسا کہ ارشاد نبوی ہے، **من يرد الله به خيراً يصب منه**، (بخاری، ۵۳۲۱) یعنی اللہ تعالی جس کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتا ہے اسے کسی نہ کسی تکلیف سے گزارتا ہے۔

۱۴۔ بیمار مومن کے لئے ایک خوشخبری: جو مومن صحت کی حالت میں نیک اعمال کی مداومت کرتا رہتا ہے، جب وہ بیمار ہو جائے اور عمل صالح نہ کر سکے تو اللہ کی طرف سے اس بندہ پر ایک احسان یہ ہوتا ہے کہ اس بندے کی نیکیاں محفوظ کر لی جاتی ہیں، یعنی اس کے حق میں برابر لکھی جاتی ہیں، خواہ وہ بے ہوش ہو، یا اس کی عقل ٹھکانے پر نہ ہو، جیسا کہ اس مفہوم کی حدیث مسند احمد میں عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو بندہ کسی جسمانی مصیبت میں گرفتار ہو تو اللہ تعالی اپنے فرشتوں کو، جو اس کے اعمال کی نگرانی کرتے تھے، حکم دیتا ہے کہ میرے بندے کے لیے روزانہ (شب وروز) جو نیک اعمال کرتا تھا، اسی کے مطابق ان دنوں میں بھی لکھ دیا کرو''۔ (مسند احمد، ۲۴۸۲، صحیح الجامع، ۸۰۰)

۱۵۔ بیماری کے ذریعہ ہی عافیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اگر بیماری نہ ہوتی تو عافیت کی قدر و قیمت نہ جانی جاتی۔ مومن کا ہر معاملہ خیر سے شروع اور ختم ہوتا ہے۔ کسی بھی حالت سے نفرت نہ کی جائے، اور نہ کسی حالت کے تعلق سے یہ خیال کیا جائے کہ یہ دائمی اور لازوال ہے۔ صرف اللہ کی ذات ہی باقی، ابدی اور لافانی ہے، ہر چیز میں فنا مقدر ہے،، **اللهم اشف مرضانا ومرضى المسلمين ، يا أرحم الراحمين ،**

قرآن اور شفاء۔ علاج اور معالجے کے لیے سب سے بہتر

راستہ قرآن کا راستہ ہے یعنی قرآن سے شفا حاصل کرنا۔ قرآنیات سے علاج کرنے والوں سے رجوع کرنا اور اللہ کی کتاب کو کتاب شفا ہونے پر کامل یقین رکھنا، اسے پڑھ کر دم کر لینا، کسی مشروب پر دم کر کے پینا، وغیرہ سلف صالحین سے ثابت ہے، ذیل میں آیات شفاء کا تذکرہ ہے:

۱۔ قال تعالیٰ: وَاِذَامَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنَ".

ترجمہ: اور جب میں بیمار ہوجاؤں تو وہ مجھے شفاء عطا فرماتا ہے"۔(الشعراء/۸۰)

۲۔ "وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَاهُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا" (اسراء: ۸۲)

ترجمہ: یہ قرآن جو ہم نازل کر رہے ہیں مومنوں کے لیے تو سراسر شفا اور رحمت ہے۔ ہاں ظالموں کو نقصان سے بڑھ کر اور کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔

۳۔ يٰاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ'(یونس ۵۷)'.

اے لوگو! تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس ایک ایسی چیز آئی ہے جو نصیحت ہے اور دلوں میں جو روگ ہیں ان کے لیے شفاء ہے اور رہنمائی کرنے والی ہے اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے۔

بیمار پرسی: بیمار پرسی اجتماعی زندگی کی ضرورت کے ساتھ اسلامی نقطہ نظر سے ایک اہم عبادت ہے، باہمی تعاون اور غم خواری کے جذبہ کو ابھارنے کا ذریعہ بھی ہے، بلکہ اللہ تعالی سے محبت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ بندہ اس کے بندوں کا خیر خواہ، غم خوار، مونس و ہمدرد بھی رہے۔ دوسروں کی ہر خوشی وغم میں شریک رہنا بھی محبت الٰہی کو پانے کا سبب بنتا ہے، نیز بیماروں اور پریشان حال بندوں سے غفلت درحقیقت خالق کائنات سے ہی (معاذ اللہ) غفلت کا موجب ہے، نیز بیمار پرسی سے پہلے یہ عقیدہ بھی کمال کے درجہ میں ہو کہ مرض اور شفا اللہ ہی کی طرف سے ہے، کسی کی بیماری کسی کو نہیں لگتی جب تک کہ اللہ نہ چاہے، خالق خیر اور خالق شر اللہ ہی ہے، مصائب وآلام اللہ کی طرف سے آزمائشیں ہیں، جو اسی کے حکم سے آتی ہیں، اللہ سے شفا طلب کرنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر اور حکیم معالج ضرور ہیں مگر شافی صرف اور صرف اللہ ہی ہے۔

نوٹ۔ شفا طلب کرنے کے لیے حرام اور شرکیہ طریقۂ علاج سے کلی طور پر اجتناب کیا جائے۔

نوٹ۔ ہر بیماری کے پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ نے شفا کے اسباب بھی پیدا فرمائے ہیں، لہذا صحیح اور مناسب علاج کی تلاش بھی شرعاً مطلوب ہے۔

بیمار پرسی بھی ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کے لئے واجبی حقوق میں سے ہے، جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے: ''حضرت ابو ہریرۃؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حقوق ہیں۔ سلام کا جواب دینا، بیمار کی بیمار پرسی کرنا، جنازوں کے پیچھے چلنا، دعوت کا قبول کرنا اور چھینکنے والے کے چھینکنے پر یرحمک اللہ سے جواب دینا"۔(بخاری1240، مسلم2162)

زندگی سے نا اُمید مریض کی دُعا

۱- اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ وَارْحَمْنِيْ وَاَلْحِقْنِيْ بِالرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى. (بخاری: ۱۰/۷)، (مسلم: ۴/ ۱۸۹۳)

ترجمہ: اے اللہ! مجھے معاف فرما، مجھ پر رحم فرما اور مجھے رفیق اعلیٰ کے ساتھ ملا دے۔

۲- لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اِنَّ لِلْمَوْتِ سَكَرَاتٍ. (بخاری:

۱/۷)، (مسلم: ۱۸۹۳/۴)

۳- لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه وَاللّٰهُ اَكْبَرُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَه، لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَه، لَاشَرِيْكَ لَـه، لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ لَـهُ الْـمُـلْـكُ وَلَـهُ الْحَمْدُ لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَاحَـوْلَ وَلَا قُـوَّةَ اِلَّا بِـاللّٰـهِ. (ترمذی: ۱۵۲/۳)، (ابن ماجه: ۱۷/۲ ۳)

ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی (سچا) معبود نہیں۔ یقیناً موت کی بہت سی سختیاں ہیں۔ اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں۔ اوراللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی (سچا) معبود نہیں، وہ اکیلا ہے اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں وہ اکیلا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں، اللہ کے سوا کوئی (سچا) معبود نہیں۔ اسی کی ہی بادشاہت ہے۔ اسی کے لیے ہی ہے ہر تعریف۔ اللہ کے علاوہ کوئی (سچا) معبود نہیں اور اللہ کی توفیق کے بغیر گناہ سے بچنے کی ہمت ہے نہ نیکی کرنے کی طاقت ۔

مصیبت زدہ کو دیکھ کر پڑھنے کی دُعا

اَلْـحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَـلَاکَ بِهٖ وَفَـضَّـلَـنِـیْ عَـلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِیْلًا (ترمذی: ۴۹۴/۵-۴۹۳) ترجمہ: ہر قسم کی تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے اس چیز سے عافیت دی جس میں تجھے مبتلا کیا ہے اور اس نے مجھے (اپنی) بہت سی مخلوق پر فضیلت عطا فرمائی۔

بُری بیماریوں سے پناہ مانگنے کی دُعا

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْبَرْصِ وَالْجُذَامِ وَالْجُنُوْنِ وَمِنْ سَیِّیِٔ الْاَسْقَامِ (اَبُوْدَاوٗد)

''اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں برص، جذام، دیوانگی اور دوسری بُری بیماریوں سے''۔

جب نبی کریم ﷺ خود بیمار ہوئے تو جبرئیلؑ نے آپ کو دم کیا اور یہ دعا پڑھی: ''بِسْـمِ اللّٰـهِ یُبْرِیْکَ وَمِنْ کُلِّ دَاءٍ یَشْـفِیْکَ وَمِـنْ شَـرِّحَـاسِـدٍ اِذَا حَسَدَ وَمِنْ کُلِّ ذِیْ عَیْنٍ. (مسلم: ۲۱۸۵)

بیمار پرسی کے چند آداب: بیمار پرسی کا فائدہ خود مریض کے پاس آنے جانے والوں کے لیے اس طرح ہے جیسا کہ ارشاد نبوی ہے: ''جب کوئی بندہ کسی مسلمان بھائی کی عیادت کرتا ہے یا اس سے ملاقات کے لئے جاتا ہے تو ایک پکارنے والا آسمان سے پکارتا ہے: تم اچھے رہے، تمھارا چلنا اچھا رہا، تم نے اپنے لئے جنت میں ٹھکانا بنالیا''۔ (سنن ابن ماجہ، ۱۴۴۳، حسن)

۱۔ بیمار پرسی کرنے والے پر سب سے پہلا حق یہ ہے کہ مریض سے اچھی گفتگو کرے یا خاموش ہی رہے، بے کار باتوں یا ڈرانے کی باتیں ہرگز نہ کرے، مایوسی اور کفریہ کلمات، بیہودہ باتوں یا مشورے سے اجتناب کرے، بلکہ مسنون طریقوں کو اپناتے ہوئے مذکورہ بالا اذکار پڑھ کر مریض کے اوپر ہاتھ رکھ کر دم کرے، اور یہ دعاء پڑھے لَا بَـأْسَ طَهُـوْرٌ اِنْ شَـآءَ اللّٰـهُ (بخاری: ۱۱۸/۱۰) ترجمہ: کوئی حرج نہیں اللہ نے چاہا تو یہ بیماری پاک کرنے والی ہے۔

اَسْـأَلُ اللّٰـهُ الْـعَـظِیْـمَ رَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ اَنْ یَشْـفِیْکَ. (تـرمذی: ۲۱۰/۲)، (صحیح الجامع: ۱۸۰/۵)

ترجمہ: میں بڑی عظمت والے اللہ سے جو عرش عظیم کا رب ہے، دعا کرتا ہوں کہ وہ تجھے شفاء عطا فرمائے۔

۲۔ مفید مشورں سے مریض کو نوازنا بھی ایک خیرخواہی ہے، اچھے اطباء یا ڈاکٹروں کی طرف رہنمائی وغیرہ بھی ہمدردی میں شامل ہے۔

۳۔ پہلے سے مختصر پروگرام کے تحت بیمار پرسی ہو، نیز مریض

کے پاس زیادہ دیر بیٹھنا بھی مریض کے لئے ،اس کے گھر والوں کے لئے زحمت ہے ،لہذا بیمار پرسی کرنے والے رحمت کا باعث بنیں ،زحمت نہ بنیں، البتہ ایک صورت یہ بھی ہے کہ مریض آپ سے مانوس ہو،مخلص دوست ہو، تو اس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے دل بہلانے کے لئے دیر تک رک جانا اچھی بات ہے۔

۴۔ بیمار پرسی میں کوئی فرق مراتب نہیں ہے، چھوٹوں اور بڑوں سب کی بیمار پرسی مسنون ہے۔ نبی کریم ﷺ سب کی بیمار پرسی کیا کرتے تھے،مسلم ہو یا غیر مسلم، بالغ ہو یا نابالغ ،کم سن ہو یا عمر رسیدہ، مرد ہوں یا خواتین ملت، سب کی بھلائی چاہنے والے ہمارے نبی ہی تھے۔ نبی کریم سے حضرت سعدؓ نے اپنی بیماری میں مشورہ طلب کیا کہ میرے وارثین میں صرف ایک ہی بیٹی ہے، کیا میں اپنے مال میں دو تہائی مال کی وصیت کر جاؤں ، آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ انھوں نے پوچھا: نصف مال کی وصیت کروں ؟ فرمایا کہ نہیں۔ پھر حضرت سعد نے پوچھا: ایک تہائی مال کی وصیت کر سکتا ہوں ؟ آپ نے اجازت مرحمت فرمائی، اور فرمایا کہ ایک تہائی بھی بہت ہے، اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے اپنا ہاتھ میری پیشانی پر رکھا اور میرے چہرے پیٹ پر پھیرا، پھر دعا کی ، اے اللہ سعد کو شفا عطا فرما ، اور اس کی ہجرت کو مکمل فرما۔(الادب المفرد للبخاری، ۴۹۹)

۵۔ غیر مسلم/ برادران وطن سے دوستی رکھنا، ان کی بیمار پرسی بھی مسنون ہے، نبی کریم ﷺ نے ایک یہودی لڑکے کی بیمار پرسی کی ، اسے اسلام کی طرف دعوت دی، لڑکے نے باپ کی طرف دیکھا اجازت لینے کی غرض سے تو باپ نے کہا کہ أطع ابا القاسم، یعنی محمد کی بات مان لے، چنانچہ لڑکا مسلمان ہو گیا، پھر نبی کریم ﷺ اس کے گھر سے بخوشی یہ فرماتے ہوئے باہر نکلے، **الحمد لله الذی أنقذه من النار** ، اللہ کا شکر ہے کہ جس نے اس کو جہنم سے بچالیا۔(صحیح البخاری، ۱۲۹۰)

۶۔ مریض کے گھر مناسب وقت پر پہنچنا تا کہ گھر والوں کو مشقت نہ ہو، مناسب جگہ بیٹھنا کہ کسی اجنبی خاتون پر نظر نہ پڑے ، اجنبی عورتوں سے بلاضرورت بات کرنے کی کوشش نہ ہو۔ اگر کوئی مرد گھر میں نہ ہو اور واپس جانا پڑے، تو برا نہ جانیں، اسی میں شاید سلامتی ہو۔

۷۔ علانیہ فسق و فجور میں مبتلا لوگوں کی عیادت سے بچنا بھی بہتر ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں کہ شراب پینے والے جب بیمار پڑیں تو ان کی بیمار پرسی کے لئے نہ جاؤ۔ (آداب زندگی، ص ۲۲۹)

۸۔ بیمار پرسی کے بعد بیمار سے بھی دعاء کی درخواست کی جائے، پتہ نہیں کس کی دعا کس کے حق میں جلد قبول ہوتی ہے، اور فرشتے کس کی دعاء پر آمین کہتے ہیں، اور وہ دعا مقبول ہو۔

۹۔ ہمیشہ اللہ تعالی سے عافیت مانگنا ، دین و دنیا کی سعادت مانگنا بھی شرعاً مطلوب ہے، صحت و تندرستی کے ساتھ اللہ کی حسن بندگی کی توفیق مانگنا بھی ضروری ہے ، سب کا بھلا چاہنا، سب کی خیر خواہی، سب کی سلامتی ، سب کے لیے دلوں کو صاف رکھنا بھی مومنین کی مطلوبہ صفات میں سے ہے۔

و الله اعلم بالصواب وهو ولی التوفیق، وصلی الله علی نبینا محمد وبارک وسلم والحمد لله رب العلمین.

☆☆☆

❑ فقہیات

غبنِ فاحش یا معمول سے زیادہ نفع لینا

مولانا ندیم احمد انصاری

اس وقت انسانیت کٹھن آزمائش سے گزر رہی ہے۔ ہر انسان اپنی صحت، معاش اور زندگی کو لے کر فکر مند ہے۔ یہ وقت ایک دوسرے کے کام آنے کا ہے، نہ کہ کسی کی مجبوری سے فایدہ اٹھانے کا۔ کسی کی مجبوری کا فایدہ اٹھانا تو عام حالات میں بھی مذموم ہے، ایسے مشکل حالات میں اس کی شناعت دو چند ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود دیکھنے میں آرہا ہے کہ بعض لوگ ذخیرہ اندوزی، گراں فروشی اور کالا بازاری میں ملوّث ہیں۔ دُکان دار کو ایک چیز دس فی صد مہنگی مِل رہی ہے، تو وہ اُسے پچیس فی صد مہنگا بیچ رہا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ چیزیں مارکیٹ میں دستیاب نہیں، لینا ہو تو لو، ورنہ جانے دو! اِن حالات میں اللہ تعالیٰ سے کس طرح رحم طلب کیا جائے؟ ضروری اشیا کی قیمتیں معمول سے زیادہ وصول کرنا یا ذخیرہ اندوزی کر کے عام منافع سے زیادہ کمانا کُھلا ظلم ہے اور جب کوئی قوم ظلم کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اُس پر عذاب مسلّط کر دیتے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے: فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ۔ کتنی بستیاں تھیں جن کو ہم نے اُس وقت ہلاک کر دیا، جب وہ ظلم کر رہی تھیں۔] الحج[اس لیے ہمیں ایسا کرنے سے توبہ کرنی چاہیے۔

غبنِ فاحش یا معمول سے زیادہ نفع لینا:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، ایک شخص آیا اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول ﷺ! نرخ (قیمتیں) مقرر فرما دیجیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں بلکہ میں دعا کروں گا! پھر ایک شخص اور آیا اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول ﷺ! نرخ مقرر کر دیجیے! آپ نے فرمایا: نہیں، اللہ تعالیٰ قیمتوں کو گھٹاتے بڑھاتے ہیں اور مَیں امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے اِس حال میں مِلوں کہ میرے پاس کسی کا کوئی ظلم نہ ہو۔] ابوداود[حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! نرخ بہت بڑھ گئے ہیں، آپ ہمارے واسطے قیمتیں مقرر فرما دیجیے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ ہی نرخ مقرر کرنے والے ہیں، وہی رزق دینے والے ہیں اور مَیں امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے اِس حالت میں مِلوں کہ تم میں سے کوئی مجھ سے کسی خون یا مال کا مطالبہ نہ کرے۔] ابوداود[چوں کہ قیمتیں طے کرنے میں کسی کے فایدے اور کسی کے گھاٹے کا احتمال ہوتا ہے، اگر

ایسا ہوا تو گھاٹے والا دامن گیر ہوگا، اس لیے آپ ﷺ نے اس سے احتراز کیا۔

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ شریعت نے تجارت میں نفع لینے کی کوئی حد یا مقدار متعین نہیں کی، جھوٹ بولے اور گاہک کو دھوکا دیے بغیر جتنا چاہیں نفع لے سکتے ہیں، لیکن خصوصیت سے اُس وقت - جب کہ ضروری اشیا کا بُحران ہو- عام معمول سے بہت زیادہ نفع لے کر بیچنا یا کسی کی مجبوری سے فایدہ اٹھانا درست نہیں، اسے 'غبنِ فاحش' سے تعبیر کرتے ہیں اور ایسا کرنا انسانی مروّت کے خلاف ہے، اس لیے اِس سے بچنا ضروری ہے۔]شرح المجلۃ رستم[فقہاے کرام نے اسے مالا یدخل تحت تقویم المقومین سے تعبیر کیا ہے یعنی ایک چیز کی قیمت کا اندازہ کئی لوگ لگائیں اور کسی کا تخمینہ اُس حد تک نہ پہنچے تو یہ 'غبنِ فاحش' ہے۔[فتاویٰ شامی]

احتکار اور اُس کی حُرمت

عربی زبان میں مہنگا بیچنے کی نیت سے غلّہ روکنے کو احتکار کہتے ہیں۔ الاحتکار لغۃ: حبس الطعام ارادۃ الغلاء۔ [الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ]شریعتِ اسلامیہ نے اس پر بھی سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے، اور احتکار کے حرام ہونے پر جمہور علما کا اتفاق ہے۔ یہ حضرات اس آیت سے استدلال کرتے ہیں: وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ اور جو کوئی شخص اس میں ظلم کر کے ٹیڑھی راہ نکالے گا، ہم اُسے دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔[الحج]

احتکار کبیرہ گناہ ہے

علامہ ابنِ حجر ہیتمیؒ نے احتکار کو کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ حدیث کے ظاہری الفاظ میں اِس پر جو شدید وعیدیں آئی ہیں مثلاً - اللہ کی لعنت اور اللہ ورسول اللہ کا اُس سے بَری الذمہ ہونا اور ایسا کرنے والے کا کوڑھ اور افلاس میں مبتلا ہونا- اِس سے احتکار کا گناہِ کبیرہ ہونا معلوم ہوتا ہے، بلکہ ان وعیدوں میں سے بعض ہی اِس کے کبیرہ گناہ ہونے پر کافی دلیل ہیں۔[الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ]

احتکار کیوں حرام ہے؟

فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ احتکار کے حرام ہونے کی حکمت عوام الناس کو ضَرر سے بچانا ہے اور اسی لیے علما کا اس پر اجماع ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی چیز کا احتکار کیا اور لوگوں کو اُس چیز کی سخت ضرورت ہو اور کسی دوسرے کے پاس وہ چیز دستیاب نہ ہو تو اِس شخص کو احتکار کی ہوئی چیز بیچنے پر مجبور کیا جائیگا، تاکہ لوگوں سے ضَرر دور ہو جائے اور باہمی تعاون کی راہ پیدا ہو۔[الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ]

ذخیرہ اندوز سے اللہ ورسول بَری ہیں

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: اگر کسی نے اِس ارادے سے ذرا بھی ذخیرہ اندوزی کی کہ مسلمانوں کے کھانے پینے کی چیزیں مہنگی ہو جائیں، تو وہ خطا کار ہے اور اللہ اور اُس کے رسول پر اُس کا کوئی ذمہ نہیں۔ ایک حدیث میں ہے: جو شخص چالیس دن تک غذائی ضرورتوں کی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے، وہ اللہ سے بَری ہے اور اللہ اُس سے بَری ہے۔ اور جس خاندان میں ایک آدمی بھی بھوکا رہا، اُن سب سے اللہ کا ذمّہ بَری ہے۔[کنز العمال]

نوٹ: اِس کی مدت میں اختلاف ہے؛ بعض کے نزدیک ایک ماہ، بعض کے نزدیک چالیس روز، غرض یہ کہ جب لوگوں کو ضرورت پڑنے لگے اور روکنے سے ضرر ہونے لگے، احتکار ہو جاتا ہے۔[امداد الفتاویٰ]

ذخیرہ اندوزی کرنے والے پر لعنت

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت

ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دوسرے شہر سے مال لانے والے کو رزق (یعنی روزی میں نفع) دیا جاتا ہے اور ذخیرہ اندوزی کرنے والا ملعون ہے۔ایک روایت میں ذخیرہ اندوزی کرنے والے کے لیے یہ بددعا بھی وارد ہوئی ہے کہ جو مسلمانوں کے کھانے پینے کی اشیا میں ذخیرہ اندوزی کرے، اللہ تعالیٰ اُسے کوڑھ کے مرض اور مفلسی میں مبتلا فرمائیں۔ [ابن ماجہ]

فروخ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے دورِ خلافت میں مسجد جانے کے لیے گھر سے نکلے تو راستے میں اُنھیں جگہ جگہ غلّہ نظر آیا۔ انھوں نے پوچھا: یہ غلّہ کیسا ہے؟ لوگوں نے بتایا: یہ درآمد کیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا: اللہ اِس میں برکت دے اور اُس شخص کو بھی جس نے اِسے درآمد کیا ہے! لوگوں نے کہا: اے امیر المومنین! یہ تو ذخیرہ اندوزی کا مال ہے! آپ نے پوچھا: کس نے ذخیرہ کر کے رکھا تھا؟ لوگوں نے بتایا: حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے غلام فروخ اور آپ کے فلاں غلام نے۔حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اُن دونوں کو بُلوا بھیجا اور فرمایا: تم نے مسلمانوں کی غذائی ضروریات کی ذخیرہ اندوزی کیوں کی؟ اُنھوں نے عرض کیا: امیر المومنین! ہم اپنے پیسوں سے خریدتے اور بیچتے ہیں (اس لیے ہمیں اختیار ہونا چاہیے)۔ آپ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: جو شخص مسلمانوں کی غذائی ضروریات کی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے تنگ دستی اور کوڑھ کے مرض میں مبتلا کر دیتا ہے۔فروخ نے تو یہ سن کر اُسی وقت کہا: امیر المومنین! میں اللہ سے اور آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آیندہ ایسا نہیں کروں گا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غلام اپنی اُسی بات پر اَڑا رہا کہ ہم اپنے پیسوں سے خریدتے اور بیچتے ہیں (اِس لیے ہمیں اختیار ہونا چاہیے)۔ ابو یحییٰ کہتے ہیں کہ بعد میں جب میں نے اُسے دیکھا تو وہ کوڑھ کے مرض میں مبتلا ہو چکا تھا۔ [مسند احمد]

مختلف صورتیں اور ان کا حکم

خلاصہ یہ کہ ذخیرہ اندوزی کی کئی صورتیں ہیں اور ہر ایک کا حکم جُدا ہے:

(۱) ایک صورت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی زمین کا غلّہ روک رکھے اور فروخت نہ کرے، یہ جائز ہے، لیکن اس صورت میں گرانی اور قحط کا انتظار کرنا گناہ ہے اور اگر لوگ تنگی میں مبتلا ہو جائیں تو اُس کو اپنی ضرورت سے زائد غلّے کے فروخت کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔

(۲) دُوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص غلّہ خرید کر ذخیرہ کرتا ہے اور جب لوگ قحط اور قلّت کا شکار ہو جائیں تب بازار میں لاتا ہے، یہ صورت حرام ہے، آں حضرت ﷺ نے اس کو ملعون قرار دیا ہے۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ بازار میں اس جنس کی فراوانی ہے اور لوگوں کو کسی طرح کی تنگی اور قلّت کا سامنا نہیں، ایسی حالت میں ذخیرہ اندوزی جائز ہے، مگر گرانی کے انتظار میں غلّے کو روکے رکھنا کراہت سے خالی نہیں۔

(۴) چوتھی صورت یہ ہے کہ انسانوں یا چوپایوں کی خوراک کی ذخیرہ اندوزی نہیں کرتا اِس کے علاوہ دیگر چیزوں کی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے، جس سے لوگوں کو تنگی لاحق ہو جاتی ہے، یہ بھی ناجائز ہے۔ [آپ کے مسائل اور ان کا حل]

☆☆☆

❑ فقہیات

نصابِ زکوٰۃ: ایک غور طلب مسئلہ

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

عَنْ إبْنِ عَبّاسٍ اَنَّ النَّبیَّ صَلّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسلّمَ بَعَثَ مَعَاذاً إلیٰ الْیَمَنِ فَقَالَ: اُدْعُھُمْ إلیٰ شَھَادَۃِ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلّا اللّٰہُ وَ اَنّی رَسُولُ اللّٰہِ، فَاِنْ ھُمْ اَطَاعُوْا لِذَالِكَ، فَاَعْلِمْھُمْ اَنَّ اللّٰہَ قَدْ فَرضَ عَلَیْھِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِیْ کُلّ یَوْمٍ وَلَیْلَۃٍ، فَاِنْ ھُمْ اَطَاعُوْا لِذٰلِكَ فَاَعْلِمْھُمْ اَنَّ اللّٰہَ قَد فَرضَ عَلَیْھِمْ صَدقَۃً تُؤخَذُ مِنْ اَغْنِیَائِھِمْ وَ تَردُّ اِلیٰ فُقَرائِھِمْ۔ (صحیح البخاری، ج۱، حدیث۱۳۱۳)

(حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا کہ وہاں کے لوگوں کو یہ دعوت دینا کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے اور میں اللہ کا رسول ہوں، پھر اگر وہ اس بات کو مان لیں تو ان کو بتانا کہ اللہ نے ان پر ہر رات دن میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں، پھر اگر وہ یہ بھی مان لیں تو ان کو بتانا کہ اللہ نے ان پر مال کا صدقہ (زکوٰۃ) فرض کیا ہے جو ان کے مالداروں سے لیا جائے گا اور انھی میں کے مفلسوں کو دیا جائے گا)۔

اس حدیث میں صدقہ سے مراد زکوٰۃ ہے جو اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے تیسرا رکن ہے، اور نماز کے ساتھ ہی قرآن میں بار بار زکوٰۃ کا ذکر آیا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ نماز ہر عاقل، بالغ، آزاد، امیر، غریب، مرد و عورت پر فرض ہے اور زکوٰۃ صرف مالداروں پر فرض ہے۔ زکوٰۃ کے بہت سے مسائل ہیں جو فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ یہاں ایک بنیادی مسئلے کی طرف علما و مفتیان کرام کی توجہ منعطف کرانا مقصود ہے کہ دورِ حاضر میں زکوٰۃ کا نصاب کیسے اور کیا متعین کیا جائے؟

مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی مایۂ ناز کتاب ''معارف الحدیث'' جلد چہارم کی کتاب الزکوٰۃ میں ایک حدیث کا ترجمہ و تشریح یوں درج ہے:

عَنْ أبی سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْسَ فِیْمَا دُوْنَ خَمْسَۃِ اَوْسُقٍ مِنَ التَّمرِ صَدقَۃٌ وَلَیْسَ فِیْمَا دُوْنَ خَمْسِ اَواقٍ مِنْ اَلوَرقِ صَدَقَۃٌ وَلَیْسَ فِیمَا دُوْنَ خَمْسِ ذَوْدٍ مِنَ الْاِبِلِ صَدقَۃٌ۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(ترجمہ) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ پانچ وسق سے کم کھجوروں میں زکوٰۃ نہیں ہے، اور پانچ اوقیہ سے کم چاندی میں زکوٰۃ نہیں ہے، اور پانچ راس اونٹوں سے کم میں

زکوٰۃ نہیں ہے۔

(تشریح) عہد نبویؐ میں خاص کر مدینۂ طیبہ کے قرب و جوار میں جو لوگ خوش حال اور دولت مند ہوتے تھے ان کے پاس دولت زیادہ تر ان تین جنسوں میں سے کسی جنس کی صورت میں ہوتی تھی: یا تو ان کے باغوں کی پیداوار کھجوروں کی شکل میں، یا چاندی کی شکل میں، یا اونٹوں کی شکل میں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ان تینوں جنسوں کا نصاب زکوٰۃ بیان فرمایا ہے۔ یعنی ان چیزوں کی کم سے کم کتنی مقدار پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ کھجوروں کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بتایا کہ پانچ وسق سے کم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، ایک وسق قریباً چھے من کا ہوتا ہے، اس حساب سے پانچ وسق کھجوریں تیس من کے قریب ہوں گی، اور چاندی کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پانچ اوقیہ سے کم میں زکوٰہ واجب نہیں ہوگی۔ ایک اوقیہ چاندی چالیس درہم کے برابر ہوتی ہے، اس بنا پر پانچ اوقیہ چاندی دو سو درہم کے برابر ہوگی جس کا وزن مشہور قول کی بنا پر ساڑھے باون تولہ (یا ۶۱۲ گرام) ہوتا ہے۔ اور اونٹوں کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ پانچ راسوں سے کم میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

اس حدیث میں صرف ان ہی تین جنسوں میں زکوٰۃ واجب ہونے کا کم سے کم نصاب بیان فرمایا گیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ پانچ وسق (تیس من کھجوریں ایک مختصر گھرانے کے سال بھر کے گذارے کے لیے کافی ہو جاتی تھیں، اسی طرح دو سو درہم میں سال بھر کا خرچ چل سکتا تھا، اس لیے اس مقدار کے مالک کو خوش حال اور صاحبِ مال قرار دے کر زکوٰۃ واجب کردی گئی۔''

(معارف الحدیث ج ۴، ص ۳۵-۳۶)

صاحب ''معارف الحدیث'' نے ص ۳۶ کے زیریں حصے میں ایک حاشیہ بھی لکھا ہے، جو درج ذیل ہے:

''حضرات علماء کرام کے لیے یہ مسئلہ قابل غور ہے کہ اب جبکہ ان تینوں نصابوں کی مالیت میں بہت بڑا فرق ہو گیا ہے اور سونے چاندی کی قیمت میں بھی بہت بڑا فرق ہے اور قریباً دنیا کے سب ملکوں میں سکہ کاغذی نوٹوں کی شکل میں ہے اور حکومتیں اپنے سکوں کی قیمت میں مختلف عوامل کے تحت کمی بیشی کرتی رہتی ہیں، تو ان حالات میں وجوب زکوٰۃ کا کم سے کم نصاب کس اصول پر متعین کیا جائے؟'' (معارف الحدیث ۴، ص ۳۶)

مولانا نعمانی مرحوم کا یہ فٹ نوٹ شاہ ولی اللہؒ کے اسی قول کی بنیاد پر ہے، جس کا ذکر بغیر کسی حوالے کے حدیث کی تشریح کے آخر میں کیا گیا ہے۔

شاہ ولی اللہ کا اقتباس، شاہؒ کی شاہکار تصنیف ''حجۃ اللہ البالغۃ'' سے ماخوذ ہے، ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کی اصل عربی عبارت جو ''مقادیر الزکوٰۃ'' کے عنوان کے تحت مسطور ہے، یہ ہے:

"قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: وَلَيْسَ فِيمَا دُوْنَ خَمْسِةِ أَوْسُقٍ مِنَ التّمر صَدَقَة، وَلَيْسَ فِيمَا دُوْنَ خَمْسِ اَواقٍ مِنَ الوَرِقِ صَدَقَةٌ وَلَيْسَ فِيْمَا دَونَ خَمْس ذَوْدٍ مِنَ الْاِبِلِ صَدقةٌ۔

اَقُولُ: اِنَّمـا قَدَّر مِنَ الحَبِّ وَالتَّمر خَمْسَةَ اَوْسُقٍ، لِاَنَّهَا تَكْفِي اَقَلَّ اَهْلِ بَيْتٍ اِلىٰ سَنَةٍ، وَ ذٰلكَ لِاَنَّ اَقَلَّ الْبَيْتِ: اَلزَّوْجُ، وَالزَّوْجَةُ وَ ثَالِثٌ خَادِمٌ اَوْ وَلَدٌ بَيْنَهُمَا۔ وَ غَالِبُ قُوتِ الْاِنْسَانِ رِطْلٌ، اَوْ مُدٌّ مِنَ الطَّعَامِ، فَاِذَا اَكَلَ كُلٌّ وَاحِدٍ مِن هٰؤلاءِ ذٰلِكَ الْمِقْدَارَ كَفاهُمْ لِسنَةٍ، وَ بَقِيَتْ بَقِيَّةٌ لِنَوائِبِهِمْ اَوْ اِدَامِهِمْ، وَ اِنّمَا قَدّرَ مِنَ الْوَرِقِ خَمْسَ اَوَاقٍ، لِاَنَّهَا مِقْدَارٌ، تَكفِىْ اَقَلَّ اَهْلِ بَيْتٍ سَنَةً كَامِلَةً، اِذا كَانَتِ الاَسْعَارُ مُوافِقَةً فِي اَكْثَرِ الاَقطار،"

(رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ ج ۴، ص ۵۴)

(''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: پانچ وسق سے کم کھجوروں میں زکوٰۃ نہیں ہے، اور پانچ اوقیہ سے کم چاندی میں زکوٰۃ نہیں ہے اور پانچ راس اونٹوں سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے'')

یہ حدیث نقل کرنے کے بعد شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

''میں کہتا ہوں کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غلہ اور کھجوروں کا پانچ وسق سے اندازہ صرف اس لیے مقرر کیا کہ پانچ وسق ایک چھوٹے خاندان کے لیے ایک سال تک کافی ہوجاتے ہیں، اور چھوٹے خاندان سے مراد شوہر، بیوی، اور تیسرا کوئی خادم یا ان دونوں کے درمیان کوئی بچہ ہوتا ہے اور انسان کی عام خوراک ایک رطل یا ایک مد ہوتی ہے، تو جب ان میں سے ہر ایک اتنی مقدار کھائے گا تو وہ (پانچ وسق) ان کے لیے ایک سال تک کافی ہوں گے اور کچھ ان کے سالن اور ہنگامی ضروریات کے بھی بچ جائے گا۔ اور چاندی کے پانچ اوقیہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے تجویز فرمائے کہ وہ ایک ایسی مقدار ہے جو نرخ کے موافق ہونے کی صورت میں اکثر ملکوں میں ایک چھوٹے خاندان کے لیے پورے ایک سال تک کافی ہوتی ہے۔''

مندرجہ بالا حدیث میں چاندی کے نصاب کی یہ تصریح کی گئی ہے کہ وہ دوسو درہم (۲۵۲½ تولہ یا ۶۱۲ گرام) ہے۔

پھر چند سطروں کے بعد شاہ ولی اللہ نے تحریر فرمایا ہے کہ:

والذهب محمول على الفضة، وكان فى ذلك الزمان صرف دينار بعشرة دراهم، فصار نصابه، عشرين مثقالا ۔(رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ ج۴، ص۶۱)

(سونا چاندی پر محمول ہے اور اس زمانے (دورِ رسالت وخلافت) میں ایک دینار کی تبدیلی (ایکس چینج) دس درہم کے ساتھ ہوتی تھی، لہٰذا سونے کا نصاب بیس دینار (بیس مثقال یا ۷½/۸۷ گرام) ہوا۔

حجۃ اللہ البالغہ کے شارح ''رحمۃ اللہ الواسعہ'' کے مصنف نے سونے کے نصاب کے بارے میں ابوداؤد، ابن ماجہ، اور نصب الرایہ کے حوالے سے متعدد روایات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مذکورہ تمام روایات گو الگ الگ ضعیف ہیں، مگر ان کا ضعف شدید نہیں ہے، پھر سب مل کر ایک قوت حاصل کرلیتی ہیں اور قابل استدلال ہوجاتی ہیں۔ (رحمۃ اللہ الواسعہ ج۴، ص۵۹)

اگلے صفحے پر شارح مرحوم نے ابن قدامہ کی کتاب المغنی سے یہ اقتباس درج کیا ہے:

"قال عامة الفقهاء: نصاب الذهب عشرون مثقالا" (رحمۃ اللہ الواسعہ ج۴، ص۶۰)

(جمہور فقہا کا قول ہے کہ سونے کا نصاب بیس مثقال (۷½ تولہ یا ۸۷½ گرام) ہے۔

''فقہ السنہ'' کے مصنف محمد عاصم الحداد نے لکھا ہے:

''جمہور (اکثریت سلف) کے نزدیک سونے کا نصاب بیس دینار (بیس مثقال: ۷½ تولہ ۸۷½ گرام) ہے اور شرح زکوٰۃ ۲½% (چالیسواں حصہ) ہے، یعنی کسی کے پاس ۷½ تولہ (۸۷½ گرام) سونا ہو اور اس پر ایک سال گذر جائے تو اس پر اس کا چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے۔ (فقہ السنہ، ص۳۰۱)

پھر مصنف نے ابوداؤد، ابوعبید، اور ابن ماجہ کے حوالے سے بیس دینار (بیس مثقال) سونے کے نصاب زکوٰۃ ہونے پر دلالت کرنے والی متعدد روایات نقل کی ہیں، اور آخر میں نیل الاوطار کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''سونے کے نصاب سے متعلق یہ سب روایات سند کے لحاظ سے ضعیف ہیں، لیکن جیسا کہ ہم اوپر بیان کرچکے ہیں کہ

جمہور کا مسلک ان ہی کے مطابق ہے''۔(فقہ السنہ،ص ۳۰۱)

امام دارالہجرت حضرت امام مالک بن انسؒ جو خود ایک بڑے محدث اور ایک فقہی مسلک کے بانی ہیں، ان کی کتاب ''موطا'' کے متعلق امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ'' اصح الکتب بعد کتاب اللہ موطا مالك '' (قرآن مجید کے بعد صحیح ترین کتاب موطا امام مالکؒ ہے)۔ (رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ ج ۲،ص ۴۹۹)

اسی مؤطا میں امامؒ کا قول ہے:

اَلسِنةُ اللَّتِی لَا اِخْتِلَافَ فِیْهَا عِنْدَنَا: اَنَّ الزَّکوٰةَ تَجِبُ فِی عِشْرِیْنَ دِیْنَاراً کَمَا تَجِبُ فِیْ مَأتَیْ دِرْهُمٍ''۔(موطا ص ۲۵۰)

(ہمارے نزدیک وہی سنت ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سونے کے بیس دینار پر زکوٰۃ واجب ہے جس طرح چاندی کے دوسو درہم پر واجب ہوتی ہے۔)

ذیل میں عصر حاضر کے معروف فقیہہ علامہ یوسف القرضاوی حفظہ اللہ کا ایک فتویٰ نقل کیا جا رہا ہے جو مسئلہ زیر بحث سے تعلق رکھتا ہے:

''سوال: روپے کی زکوٰۃ کا حساب سونے سے لگایا جائے یا چاندی سے؟

جواب: بہتر اور قرین قیاس یہی ہے کہ زکوٰۃ کا حساب سونے سے لگایا جائے نہ کہ چاندی سے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کا نصاب سونے اور چاندی دونوں سے مقرر کیا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ دو نصاب مقرر کیے جائیں، ایک چاندی کا اور دوسرا سونے کا۔ بلکہ حقیقتاً وہ ایک ہی نصاب تھا، چاہے سونے کا ہو چاہے چاندی کا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کا نصاب بیس دینار اور چاندی کا نصاب دوسو درہم مقرر کیا تھا۔ اس زمانے میں ایک دینار دس درہم کے برابر ہوا کرتا تھا۔ گویا بیس دینار اور دوسو درہم قیمت میں مساوی تھے، اس کے بعد سونے کے مقابلے میں چاندی کی قیمت مسلسل گرتی گئی اور آج یہ حالت ہے کہ سونے اور چاندی کی قیمتوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

(پھر)، اسلام میں زکوٰۃ امیروں (مالداروں) پر فرض کی گئی ہے تاکہ ان کا کچھ مال فقیروں (غریبوں) کی طرف لوٹایا جائے، اس دور میں چاندی کی قیمت اس قدر گر گئی ہے کہ دوسو درہم چاندی رکھنے والے کو ہم امیر (مالدار) نہیں کہہ سکتے؛ کیونکہ دوسو درہم کے برابر چاندی زیادہ سے زیادہ چار پانچ سو روپے کے برابر ہوگی اور چار پانچ سو روپے کی ملکیت کسی شمار میں نہیں ہے۔ اس کے برخلاف بیس دینار کے برابر سونا جو تقریباً ساڑھے سات تولہ ہوتا ہے، اس کی قیمت تیس ہزار روپے سے زیادہ ہوتی ہے۔(۱)

اگر روپے پیسے کے علاوہ ہم ایک نظر ان دوسری چیزوں پر ڈالیں جن پر زکوٰۃ واجب ہے، مثلاً اونٹ، بکری وغیرہ تو ہمارا دل اسی بات پر مطمئن ہوگا کہ سونے ہی کو روپے پیسے کا نصاب مقرر کرنا چاہیے؛ کیونکہ اونٹ اور بکری وغیرہ کی جو تعداد نصابِ زکوٰۃ کے لیے مقرر کی گئی ہے، اس کی قیمت ساڑھے سات تولے سونے کے آس پاس تو ہوسکتی ہے، لیکن دو سو درہم چاندی کے آس پاس ہرگز نہیں ہوسکتی۔ (فتاوی یوسف القرضاوی ج ۱،ص ۱۳۹)

مسطورۂ بالا عبارات واقتباسات اور حدیث وروایات

(۱) یہ اس وقت کی قیمت ہے جب علامہ قرضاوی نے یہ فتویٰ لکھا تھا۔ آج ۸/ اپریل ۲۰۲۰ء کو ۵۲ ۱/۲ تولے (۶۱۲/ گرام) چاندی کی قیمت کم وبیش ۲۵ ہزار ہے، جبکہ ۷ ۱/۲ تولہ (۸۷ ۱/۲ گرام) سونے کی قیمت ۳ ۱/۲ لاکھ سے زیادہ ہے۔

کوغور سے پڑھنے کے بعد مندرجۂ ذیل نکات واضح ہوتے ہیں:

۱- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے کے مطابق: زکوٰۃ اغنیا (مالداروں) سے لی جائے گی اور فقرا (غریبوں) کودی جائے گی۔

۲- مالدار (غنی) ہونے کا معیار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مقرر فرمایا ہے کہ جس کے پاس دوسو درہم (چاندی) یا بیس دینار (سونا) ہو وہ غنی (مالدار) ہے اوراس پر زکوٰۃ فرض ہے۔

۳- اس زمانے (عہد رسالت) میں دوسو درہم (۱/۲ ۵۲ر تولہ یا ۶۱۲ر گرام) چاندی کی قیمت وہی ہوا کرتی تھی جو بیس دینار ساڑھے سات تولہ یا ۸۷ر گرام) سونے کی ہوتی تھی۔

۴- شاہ ولی اللہ کی تحقیق کے مطابق سونے چاندی کی مذکورہ قیمت اتنی ہوتی تھی کہ ایک چھوٹے خاندان کے ایک سال کے اخراجات کے لیے کافی ہوتی تھی (بالکل اسی طرح جس طرح پانچ سو وسق کھجوروں یا پانچ راس اونٹوں کی قیمت ایک چھوٹے خاندان کی سال بھر کی ضروریات کے لیے کافی ہوتی تھی۔)

۵- عہد رواں میں ساڑھے باون (۱/۲ ۵۲) تولہ چاندی کی قیمت تین چار افراد کے ایک چھوٹے سے خاندان کے ایک سال تو کجا تین ماہ کے اخراجات کے لیے بھی بہت مشکل سے کافی ہوگی، اس صورت میں ۱/۲ ۵۲ تولے چاندی یا اس کی قیمت کے مالک کو کسی طرح بھی غنی (مالدار) نہیں کہا جاسکتا نہ اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔

۶- معلوم ہوا کہ چاندی کی قیمت کا اب کوئی اعتبار نہیں رہ گیا ہے، کیونکہ ۱/۲ ۵۲ر تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا مالک تو بیچارہ اب خود فقرا (غربا) کی صف میں آ گیا ہے، اس کو زبردستی غنی (مالدار) مان کر اس پر زکوٰۃ فرض کرنا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول..... توخذ من اغنیائھم و ترد الی فقرائھم کی خلاف ورزی اور قرآن پاک میں ''اطیعوا الرسول'' کا جو حکم بار بار دیا گیا ہے اس کے ماننے سے عملی انکار کے مترادف ہوگا۔

۷- اب فرضیت زکوٰۃ کا صحیح نصاب یہی قرار پائے گا کہ سونے کی قیمت سے حساب لگایا جائے، یعنی جس کے پاس ۱/۲ ۷ر تولہ (۱/۲ ۸۷ر گرام) سونا یا اس کی قیمت کے برابر نقدی ہوگی وہی صاحبِ نصاب اور زکوٰۃ ادا کرنے کا مکلّف ہوگا۔

مآخذ ومراجع

(۱) صحیح بخاری جلد اول، نئی دہلی، ب ت

(۲) مؤطا امام مالک، ممبئی، ب ت

(۳) معارف الحدیث چہارم، محمد منظور نعمانی، لکھنؤ ۱۹۶۷ء۔

(۴) رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ چہارم، مفتی سعید احمد، دیوبند، ۲۰۰۳ء۔

(۵) فقہ السنہ، محمد عاصم الحداد، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء۔

(۶) فتاوی یوسف القرضاوی، جلد اول، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء۔

☆☆☆

❑ مطالعۂ قرآن ❑ قسط:۱

کامیابی کی قرآنی علامتیں

ڈاکٹر طارق ایوبی

نوٹ: پریل ۲۰۱۷ء میں راقم کی یہ کتاب شائع ہوئی تھی، جس کا تعلق تزکیہ نفس واخلاق، اصلاح فرد واصلاح معاشرہ سے ہے، جس میں قرآن مجید کی ان آیات کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو انسان کو تزکیہ کی دعوت دیتی ہیں اور کامیابی کی علامات سے واقف کراتی ہیں، اب افادۂ عام کی غرض سے اس کو ۴؍قسطوں میں ندائے اعتدال کے قارئین کی نذر کیا جارہا ہے، پہلی قسط میں مقدمہ کتاب ملاحظہ کیجئے، جس سے معلوم ہوگا کہ یہ کتاب کیوں وجود میں آئی، تزکیہ کیا ہے اور قرآن اس بابت کیا مطالبہ کرتا ہے اور کس طرح رہنمائی کرتا ہے، محمد غزالی ندوی مرحوم اور برادر گرامی مجیب الرحمٰن ندوی کی بھی بڑی پر مغز تحریریں تھیں، بعد میں ان شاء اللہ انھیں بھی شائع کیا جائے گا۔ (مدیر)

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، وہ دنیائے انسانیت کا سب سے بڑا معجزہ ہے، اسے دنیا کی ہدایت کے لیے اتارا گیا ہے، اس کی آیات جوامع الکلم کی مصداق ہیں، اس کا لفظ لفظ معانی کا سمندر ہے، اس کا حرف حرف معجزہ ہے، وہ ایسا مکمل کلام برحق ہے جو مالک برحق کی طرف سے پیغمبر برحق پر پوری انسانیت کی رہنمائی کے لیے اتارا گیا ہے، یہ وہ کتاب ہے جو قلب وروح کے لیے شفاء ہے، متقین کے لیے سامان ہدایت ہے، معاندین کے لیے تازیانۂ عبرت ہے، اہل ایمان کے لیے سرتاپا نصیحت ہے، جس میں احکام شریعت کا بیان ہے، قدرت کے عجائبات کا ذکر ہے، قادر مطلق اور خالق کائنات کی قدرت اور اس کے کمال کے مظاہر کا تذکرہ ہے، خدا کی نعمتوں کے تذکرے کچھ اس انداز سے ہیں کہ انسان ان کی طرف کھنچتا ہے، عذاب کا بیان کچھ اس طرح ہے کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے، اللہ کے نیک بندوں، انبیاء اور ان کے متبعین کے حالات و واقعات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ نصیحت حاصل کرنے والے نصیحت حاصل کریں اور اپنی دنیا وآخرت سنواریں، اپنی قسمت جگائیں، کفار ومشرکین، نافرمان ومعاندین اور منافقین کے کردار وعمل اور پھر ان پر مسلط ہونے والے عذاب کا تذکرہ اس اسلوب میں ہے کہ عبرت حاصل کرنے والے عبرت حاصل کریں، اس سے سبق لیں، اور ان اسباب ورذائل سے بچتے ہوئے دنیا وآخرت کی کامیابی کے حق دار بن جائیں، قرآن مجید علوم وفنون کا خزانہ ہے، اس کی برکتیں متنوع اور بیش بہا ہیں، اس کی عنایتیں قوموں کے عروج اور انسانی زندگی کے مثال بن جانے کے لیے کافی ہیں، اس سے تعلق رفع درجات اور کامیابی کا سبب ہے، اس سے دوری اور لاتعلقی ناکامی وزوال کا پیش خیمہ ہے، قرآن مجید کا حق ہے کہ اس کو پڑھا جائے، اس کو سمجھا جائے، اس پر عمل کیا

جائے،اس کی نشرواشاعت کی جائے۔

قرآن مجید کے ان حقوق کی ادائیگی میں امت کی سربلندی ہے ، کیونکہ وہ قوامِ دین ہے، دستورِ حیات ہے ،قانون کی کتاب ہے،وہ نقطۂ اتحاد ہے،وہ مرکز اتصال ہے، اس میں نظام زندگی ،نظام بندگی ، نظام عبادات و طاعت ، اخلاق فاضلہ اور عادات رذیلہ کا واضح بیان ہے،اس میں فرد کی اصلاح اور کامیابی کے ساتھ معاشرہ کی اصلاح اور اجتماعیت کی فلاح کا تذکرہ ہے،اس میں معیشت،تجارت،اور حکومت کے قوانین کا بیان ہے،وہ کتاب انقلاب ہے، اس کتاب کے ذریعہ سے وہ تاریخی انقلاب برپا ہوا جس کا نظارہ اس سے قبل نہ زمین دیکھا تھا نہ چشم فلک نے،زندگیاں بدل گئیں،معاشرہ تبدیل ہوگیا، دنیا پر امن وسلامتی کا اقتدار قائم ہوگیا،اس کی آغوش میں آئے تو مظلوم حکمراں بن گئے،ان پڑھ بدو امام وقت ہو گئے، قیصر وکسریٰ کا نام ونشان مٹ گیا، جاہلیت کی تاریخ قصۂ پارینہ ہوگئی، یہ کتاب نبی پاکؐ کی سیرت ہے، اخلاق واعمال کی تطہیر اور انسان کا تزکیہ اسی کے ذریعہ ہوسکتا ہے،حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہمارا رشتہ اس صحیفۂ انقلاب سے استوار نہ ہوگا، جب تک امت کے قلوب کو اس کے نور سے منور نہیں کیا جائے گا تب تک منزل مقصود اور مطلوب کامیابی کا حصول ناممکن ہے۔

قرآن مجید سے استفادہ کی دوصورتیں ہیں،ایک کا تعلق علماء اور مجتہدین سے ہے،جن کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ دین کا گہرا علم اور عمیق فہم حاصل کریں فرمایا گیا:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُواْ كَآفَّةً فَلَوْلاَ نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُواْ فِي الدِّيْنِ وَلِيُنذِرُواْ قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُواْ إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُون. (التوبہ: ۱۲۲)

ترجمہ: تمام اہل ایمان (اپنے اپنے علاقوں سے) نکل کر کھڑے ہوں یہ تو ہونا نہیں ہے،تو ایسا کیوں نہ ہو، کہ ہر آبادی سے ایک تعداد نکلے (جو اپنے اپنے علاقوں سے مرکز اسلام میں جائے) تاکہ دین میں تفقہ حاصل کرے (ایمان، اسلام اور احسان کی تفصیلات کو اچھی طرح سمجھے ،عقائد، شریعت اور تزکیہ سے بخوبی واقف ہو) اور اپنے لوگوں کو واپس آکر خبردار کرے،متنبہ کرے،تاکہ وہ چوکنا ہوں (خطرات کو سمجھیں اور فکرمند ہوں)

اس کے ذریعہ اپنی قوم کی تعلیم اور دین کی تعبیر وتشریح اور شریعت کی حفاظت کا کام کریں، یہاں غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس طرح استفادہ کرنے والے اور فائدہ پہنچانے والے تمام افراد ملت نہیں ہوسکتے لیکن ہر قوم، ہر خاندان، ہر بستی میں سے کچھ لوگوں سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے "طائفة منهم "کی قید سے یہ مفہوم واضح ہے،قرآن مجید سے استفادے کی دوسری صورت قرآن مجید کا وہ مطالبہ ہے جو عام ہے اور دنیا کے ہر انسان سے ہے،یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے اس مطالبہ کی بابت یہ فرمایا ہے ولقد يسرنا القرآن للذكر فهل من مدكر (قمر:۲۲) قرآن مجید کو عبرت ونصیحت حاصل کرنے کے لیے بہت آسان بنا کر اتارا گیا ہے، جو اس سے عبرت ونصیحت حاصل کرنا چاہے وہ اس میں بیان کردہ عذاب وثواب کے تذکروں اور صالحین اور ان کے مخالفین کے واقعات وانجام سے عبرت حاصل کرے، دنیا کے ہر انسان سے اس حیثیت سے قرآن مجید کا یہی مطالبہ ہے،قرآن مجید میں متعدد مقامات پر تدبر کتاب کی دعوت دی گئی ہے:

أَفَلاَ يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللّهِ لَوَجَدُواْ فِيْهِ اخْتِلاَفاً كَثِيْراً. (النساء: ۸۲)

ترجمہ: یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے ؟اگر وہ اللہ کے پاس سے نہ آیا ہوتا،تو یہ اس میں بہت اختلاف اور تضاد پاتے۔

أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ أَمْ جَاءَ هُم مَّا لَمْ يَأْتِ آبَاءَ هُمُ الْأَوَّلِينَ (المومنون: ٦٨)

ترجمہ: کیا انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا؟ یا ایسی بات سامنے آگئی جو ان کے باپ دادوں کے سامنے نہیں آئی تھی؟

كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ. (ص: ٢٩)

ترجمہ: ہم نے یہ بابرکت کتاب تمہاری طرف اس لیے نازل کی ہے کہ یہ لوگ اس کی آیتوں اور ہدایتوں پر غور کریں اور عقلمند اور سمجھدار لوگ نصیحت حاصل کریں۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (محمد: ٢٤)

ترجمہ: کیا یہ قرآن پر غور نہیں کرتے ، یا ان کے دل ودماغ پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔

یہ مطالبہ جو بار بار کیا گیا ہے اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ مجتہدانہ ذہن اور مطلوبہ استعداد رکھنے والے اہل علم قرآن مجید میں اس طرح تدبر کریں کہ ان پر عجائبات قدرت اور اسرار قرآن منکشف ہوتے چلے جائیں، واقعہ یہی ہے کہ جب اس سطح کے اہل علم نبی پاک ﷺ کے فرمودات اور صحابہ کی تشریحات کی روشنی میں تدبر کرتے ہیں تو اصول شریعت کی روشنی میں ایک ایک آیت اور ایک ایک فقرہ سے سیکڑوں مسائل کا حل پیش کرتے ہیں، اس کے برعکس متوسط درجہ کے پڑھے لکھے اور ہم جیسے ابجد سے واقف لوگوں سے تدبر کے مطالبہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ ائمہ مجتہدین اور سلف امت کی تفسیروں کے ذریعہ روح قرآن تک پہنچنے کی کوشش کریں ، ایک عام انسان ، عام قاری سے تدبر کا بس اس قدر مطالبہ ہے کہ قرآن کو کسی معتبر ترجمہ سے سمجھ لے، آیات بشارت، آیات وعید، آیات تشویق، آیات تہدید اور واقعات کو پڑھے اور ان سے عبرت حاصل کرے ،قرآن کو سمجھنے کے لیے یہ وہ حدود ہیں جن کا لحاظ بہرحال ضروری ہے، اس سے آگے بڑھنے کی کوشش میں نقصان ہے، کتاب اللہ میں شتر بے مہار کی طرح عقل بے مہار کو دوڑانے والے اوندھے منہ گر پڑتے ہیں، اپنی حدود میں رہ کر، اہل علم سے رجوع کرتے ہوئے اس کی روح تک پہنچنے کے طلبگاروں پر اس کے راز کھلتے جاتے ہیں، تعلق بڑھتا جاتا ہے، اور پھر قرآن ان کی زندگی کا آئینہ بن جاتا ہے۔

سچ یہ ہے کہ جو اثرات آیات قرآنی کے مرتب ہو سکتے ہیں، جو ثمرات تلاوت قرآن اور فہم قرآن کے مل سکتے ہیں، جو تاثیر قرآن مجید میں رکھی گئی ہے وہ دنیا کی کسی کتاب کا حصہ نہیں، اس کو سمجھنے کی کوشش نہ کرنا، اس کو پسِ پشت ڈالنا اور اس سے رہنمائی نہ لینا انتہائی خطرناک ہے۔

قرآن مجید میں تدبر کرنے یا عام الفاظ میں اس کو سمجھ کر پڑھنے سے اس رب کریم کی معرفت حاصل ہوتی ہے، جس کی طرف خود قرآن بلاتا ہے، اور جس کی طرف ہر کس وناکس کو لوٹ کر جانا ہے، قلب ودماغ میں اس کا تصور سما جاتا ہے، انسان قرآن کی ترغیب وترہیب سے متأثر ہوتا ہے، فکر میں عمق اور وسعت پیدا ہوتی ہے، قوت تمیز میں اضافہ ہوتا ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ اس کتاب کو دنیا کے سامنے قابل فہم اور قابل عمل بنا کر پیش کیا جائے، اسی کی زبان میں خوش خبری سنائی جائے، اسی کے اسلوب میں شوق دلایا جائے اسی کے طریقہ پر ظاہر وباطن کی تطہیر کا کام کیا جائے ، امت کا رشتہ اس کتاب مقدس سے جوڑنے کے لیے ہی خاندان ولی اللہی نے تحریک چلائی، آگے چل کر ان کی کوششیں اور برگ وبار لائیں، حضرت شیخ الہند نے اسی ضرورت کا ادراک کیا اور پھر قرآن کا ترجمہ ہی اس لیے کیا کہ امت کو پستی سے نکالنے اور اس کے زوال کا علاج کرنے کا صرف واحد نسخہ یہ ہے کہ امت کو قرآن سے جوڑ دیا جائے۔

یہ قرآن سمجھنے کے لیے آیا ہے، اور اس کی شریعت عمل

کرنے کے لیے آئی ہے، یقیناً شریعت بہت آسان ہے، ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اس کو آسان بنا کر پیش کریں، اسی کا ہم کو حکم دیا گیا ہے، قرآن مجید نے خود اس کا ذکر کیا ہے، خود تشریع میں اس کا خیال رکھا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ. (البقرہ:۱۸۵)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، وہ تمہارے حق میں دشواری، تنگی نہیں چاہتا۔

رسول اللہ ﷺ نے دین کی جس طرح تشریح فرمائی ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آپؐ نے آسانیوں کا بھرپور خیال رکھا ہے، فطرت انسانی کا لحاظ رکھا ہے، آنحضرت ﷺ کی متعدد احادیث میں آسانی اور سہولت کی تلقین کی گئی ہے، امام احمد کی ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "إن خير دينكم أيسره، إن خير دينكم أيسره" اور دوسرے الفاظ میں فرمایا: "إنكم أمة أريد بكم اليسر" (احمد ۵/:۳۲) حضرت انسؓ کی مشہور اور متفق علیہ روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "يسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا" (مسلم ۴/ ۴۵۲۸) حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت بھی دیکھئے: "قال رسول اللهﷺ إن الدين يسر ولن يشاد الدين احد إلا غلبه فسددوا وقاربوا وابشروا واستعينوا بالغدوة والروحة وشئى من الدلجة" (فتح الباری:۱/۳۹)

واقعہ یہ ہے کہ اگر دین کو آسان بنا کر پیش کیا جائے تو عمل کرنے کی ہمت زیادہ ہوتی ہے، پھر اوامر پر جمنا اور منہیات سے بچنا آسان ہو جاتا ہے، انسان جو کام شروع کرتا ہے اس پر قائم رہنا ممکن ہوتا ہے، پھر دینداری کے اثرات عبادات، عادات، معاملات واخلاق سب پر پڑتے ہیں، سچی بات یہ ہے کہ وہ سہولت ویسر جس میں کسی طرح کے گناہ کا شائبہ نہ ہو، اس کو اختیار کرنا رسول اللہ ﷺ کی سنت کا اتباع ہے، اس لیے دعوت واصلاح کی مہم میں اس پہلو کا لحاظ بہت ضروری ہے، آج دین کی تشریح کچھ اس طرح کی جاتی ہے، اصلاح کو اس قدر مشکل بنا کر پیش کیا جاتا ہے کہ لوگ بدکتے ہیں، جب تک نسبتیں نہ ہوں، وابستگی نہ ہو اور کسی سے خاص تعلق نہ ہو تب تک کوئی اعتبار نہیں کیا جاتا۔

دنیا دار العمل ہے، یہاں کے عمل پر ہی آخرت کی کامیابی کا مدار ہے، آخرت کی کامیابی ہی اصل کامیابی ہے، دنیا کی بے ثباتی مسلم اور اس کی فنا ایک حقیقت ہے، جس کو فنا کا خطرہ لاحق ہو وہ مکمل کامیابی کی جگہ نہیں ہو سکتی، اس دنیا میں اگر دولت قارون اور عیش فرعون وسلطنت سکندر ہاتھ آجائے تو بھی کامیابی کا تصور مکمل نہیں، اس لیے کہ تمام اسباب کمال حاصل ہو جانے کے بعد بھی زوال کا خوف باقی ہے، مال واولاد اور حشم وخدم کے ساتھ خود کی صحت کو ہر آن خطرہ لاحق ہے تو پھر اس دنیا میں مکمل کامیابی کا تصور کہاں اور کیوں کر ممکن، یوں بھی امتحان کا ہال کامیابی کی جگہ نہیں، یہ دنیا امتحان ہال ہے، اصل کامیابی کا پتہ نامۂ اعمال ہاتھ آنے کے بعد چلے گا:

فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِيْنِهِ فَيَقُولُ هَاؤُمُ اقْرَؤُوا كِتَابِيَهْ (۱۹) إِنِّي ظَنَنتُ أَنِّي مُلَاقٍ حِسَابِيَهْ (۲۰) فَهُوَ فِي عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ (۲۱) فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ (۲۲) قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ (۲۳) كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيْئاً بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ (۲۴) وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ فَيَقُولُ يَا لَيْتَنِي لَمْ أُوتَ كِتَابِيَهْ (۲۵) وَلَمْ أَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ (۲۶) يَا لَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ (۲۷) مَا أَغْنَى عَنِّي مَالِيَهْ (۲۸) هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيَهْ (۲۹) (الحاقه)

ترجمہ: پس جس کو اس کے دائیں ہاتھ میں اس کا اعمال

نامہ دیا جائے گا، وہ (خوشی اور مسرت میں) کہے گا: آؤ میرا اعمال نامہ پڑھو، مجھے یقین تھا کہ مجھے اپنے حساب کا سامنا کرنا ہے، پھر وہ من پسند کی زندگی (ہنسی خوشی کی زندگی) بلند و بالا جنت میں گزارے گا، جس کے پھل (لدی شاخوں کے جھکنے سے) قریب آرہے ہوں گے، (کہا جائے گا:) کہ گزرے ہوئے دنوں میں تم نے جو عمل کئے اس کی جزا میں اب مزے سے کھاؤ پیو۔ اور جس کو اس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، وہ کہے گا: اے کاش کہ مجھے میرا اعمال نامہ نہ دیا جاتا، اور مجھے نہ معلوم ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے، اے کاش کہ میری موت ہوجاتی، میرے مال نے مجھے کچھ فائدہ نہ دیا، میری ساری طاقت تباہ و برباد ہوگئی۔

اس کامیابی تک پہنچنے کے لیے قرآن مجید نے مجاہدہ نفس کی تعلیم دی ہے، محاسبہ نفس کی تلقین کی ہے، تزکیہ واحسان کا ذکر کیا ہے، متقین وصالحین کے اوصاف کا تذکرہ کیا ہے، فاسقین و منافقین کے کردار کو بیان کیا ہے، انسان کو اگر سیدھے سادے انداز میں ان حقائق سے روشناس کرایا جائے تو اس کے لیے اثر قبول کرنا کچھ مشکل نہیں، قرآن مجید نے اس قدر آسان اسلوب میں مومنین کاملین کی صفات اور محبوب بندوں کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے کہ ان تک پہنچنا اور اپنے آپ کو ان کے سانچے میں ڈھالنا بہت آسان ہے، تزکیہ واحسان کا عمل نہ فلسفیانہ مباحث کا محتاج ہے اور نہ ہی اسے قرآن وحدیث اور سیرت نبوی سے ہٹ کر کسی اشراقی نظریے یا کسی پُر پیچ طریقے کی ضرورت ہے، معلوم نہیں کس کا شعر ہے مگر زبان پر آجایا کرتا ہے ؎

ملا کر رنگ اس میں پیش کیوں کرتا ہے تو واعظ
جسے اسلام کہتے ہیں وہی اسلام رہنے دو

تزکیہ انسان کی ضرورت ہے، انبیاء کی بعثت کا ایک مقصد ہے، تزکیہ نام ہے تطہیر کا، ظاہر و باطن کو پاک کرنے کا، اچھی اور پاکیزہ شخصیت کو پروان چڑھانے کا، تزکیہ نام ہے بہتر سے بہتر کی جستجو کا، عقل وفکر، قلب و دماغ اور اخلاق وکردار اور عمل کو اسلام کے دائرہ اعتدال میں لانے کا، تزکیہ کوئی معمہ نہیں ہے، کوئی پہیلی نہیں ہے، عنقا نامی پرندہ نہیں ہے جس کا صرف تصور تو ہو لیکن وجود نہ ہو، تزکیہ علم میں بھی مقصود ہے عمل میں بھی، معاملات میں بھی مقصود ہے اور اخلاقیات میں بھی، نبی پاک علیہ السلام کے مقصد بعثت اور فرائض منصبی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِیْ الْأُمِّیِّیْنَ رَسُولاً مِّنْهُمْ یَتْلُو عَلَیْهِمْ آیَاتِهِ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِیْ ضَلَالٍ مُّبِیْنٍ(الجمعه: ۲)

ترجمہ: وہی ہے جس نے امی قوم (ان پڑھ قوم) میں انہیں میں سے ایک پیغمبر مبعوث فرمایا، جو ان کے سامنے اللہ کے کلام کی آیتیں پڑھ کر سنا رہا ہے، اور ان کا تزکیہ فرما رہا ہے، (ان کی عادتوں، اخلاق اور ظاہر و باطن کو سنوار رہا ہے) اور انہیں الکتاب (قرآن مجید) کا علم دے رہا ہے، اور حکمت (دانشمندی، تہذیب وسلیقہ مندی) کی باتیں سکھا رہا ہے، اس سے پہلے وہ لوگ کھلی گمراہی میں تھے۔

سورہ بقرہ میں یہی مضمون اس طرح آیا ہے:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ یَتْلُو عَلَیْهِمْ آیَاتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ إِنَّكَ أَنتَ العَزِیْزُ الحَكِیْم(البقره: ۱۲۹)

ترجمہ: اے ہمارے مالک! (ہماری ذریت سے اٹھنے والی امت مسلمہ میں) ایک رسول بھی ان ہی میں سے مبعوث فرمادے، جو ان کو تیری کتاب کی آیتیں پڑھائے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ فرمادے، بیشک تو ہی غالب بھی ہے اور حکمت والا بھی۔

ان آیات میں آپ غور کیجئے تو تلاوت کتاب اور تزکیہ کے ساتھ تعلیم کتاب وحکمت حضور ﷺ کے مقاصد بعثت قرار پاتے ہیں، گویا تین انعامات ہیں جو مقاصد بعثت رسول کی صورت میں امت کو عطا کئے گئے ہیں، اس میں پہلا مقصد تلاوت کتاب ہے، کہ رسول ﷺ قرآن مجید کی آیات پڑھ پڑھ کر سناتے تھے، قرآن کے پڑھنے کو یہاں کسی اور لفظ کے بجائے "تـلا یتلو" سے تعبیر کیا گیا، یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ تلاوت کا لفظ صرف قرآن یا دیگر آسمانی کتابوں کے لیے خاص ہے، ان کتابوں کے الفاظ ومعانی دونوں مستقل طور پر مقصود ہیں، ایسا نہیں کہ لفظ مقصود ہیں اور معنی نہیں، یا معانی مقصود ہیں لفظ سے مطلب نہیں، بلکہ دونوں اپنی اپنی جگہ مقصود بالذات ہیں، تلاوت وتعلیم کے علحدہ ذکر سے خود یہ بات مستفاد ہے، اور پھر اہم بات یہ ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ کا بھی مکمل اور من وعن اتباع لازم ہے اس میں کسی طرح کے تغیر و تبدیلی اور کمی زیادتی کی گنجائش نہیں۔

تزکیہ سے مراد تطہیر یعنی پاک کرنا ہے، ظاہر ہے کہ بعثت رسول انسانوں کی ہر طرح تطہیر کے لیے ہی ہوئی تھی، بہ لحاظ عقائد واخلاق ومعاملات پاک کرنا بھی مقصود تھا اور بہ لحاظ قلب ودماغ وروح پاک کرنا بھی مقصد تھا، حکمت عربی میں کئی معنی کے لیے بولا جاتا ہے عدل و انصاف، دانائی و دانشمندی، حق بات تک پہنچنا، علم صحیح اور اس قوت وصلاحیت کو بھی حکمت کہا جاتا ہے جس کے سبب حق کے مطابق معاملات کا فیصلہ کیا جائے۔

ذرا غور کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ تلاوت وتعلیم کے درمیان تزکیہ کا ذکر فرمایا گیا، جس سے ایک طرف تزکیہ کی اہمیت اجاگر ہوئی کہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں یہ کس قدر مقصود ومطلوب ہے، اور دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ تلاوت وتعلیم میں فرق ہو گیا، جس طرح قرآن مجید کے الفاظ بغیر کسی ادنی تغیر کے پڑھنا مقصد ہے، اور ہر حرف پر نیکی کا وعدہ ہے، اسی طرح قرآن مجید کو سمجھنا، اس میں غور وفکر کرنا، اس کی روح کو اپنے اندر اتارنا مقصد ہے، نبیؐ کی بعثت کا ایک مقصد تو یہ ذکر کیا گیا کہ وہ ظاہر کے اعتبار سے بھی انسان کی تطہیر اور اس کے عقل، فکر، عقائد قلب، روح، اخلاق ومعاملات کو بھی پاک کرے، تیسرا اور اہم مقصد تعلیم کتاب وحکمت کو قرار دیا گیا کہ نبیؐ دانشمندی کی باتیں سکھاتے ہیں، قرآن مجید کی تشریح کرتے ہیں، اس کے مطالب و مفاہیم کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں، امت کے قلوب تک اس کی روح منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کو سمجھنے کی راہ میں جو مشکلات پیش آتی ہیں انہیں حل کرتے ہیں، یہاں یہ بات سمجھ لینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ انسانوں کی ہدایت کے لیے انبیاء ورسل مبعوث فرمائے اور ان پر کتابیں نازل فرمائی ہیں، یہاں بھی صرف نزول قرآن پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ نبی کو اس کتاب کی تعلیم کا حکم فرمایا گیا، آئندہ یہ امر یعنی تعلیم کتاب آپ کی تشریحات وتوجیہات اور آپ کے شاگردوں کی توجیہات وتصریحات پر منحصر ہو گیا، چنانچہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اہل علم اور معتبر علماء سے رجوع کیا جائے، ورنہ معتبر تفسیر وترجمہ پر انحصار کیا جائے، نبی کی بعثت کے ان تین مقصد کے مجموعہ کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ استفادہ کرنا مشکل نہیں کہ تلاوت کا سیکھنا، معلم کا ہونا اور کتاب وحکمت کو سمجھنا ہماری زندگی کا مقصد ہے۔

بدقسمتی یہ ہے کہ عرصہ سے ان تینوں مقاصد کو دنیا کے جنجالوں کی نذر کر دیا گیا، جس کے نتیجہ میں وہ جامعیت جو اصل تھی مفقود ہو گئی، یا تو صرف تلاوت کے فضائل بیان کئے جانے لگے، یا تو صرف علمی استعداد اور نکتہ سنجی اور فنی مہارت پر زور دیا جانے لگا، دونوں کے درمیان مقصد اصلی بلکہ بنیادی مقصد

تزکیہ کو ایک ایسا رنگ دے دیا گیا کہ اکثریت اس سے بدکنے لگی ، بھاگنے لگی ،اس کو فلسفیانہ بحثوں کا مرقع بنا دیا گیا ، اس کے علاوہ یہ بھی ہوا کہ تزکیہ کو ایک خاص طبقہ کی محنت کا میدان سمجھا جانے لگا، اس بات کی طرف توجہ نہیں دی گئی کہ تزکیہ ہر انسان کی ضرورت ہے اور قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کا حصول نہایت آسان ہے، جس کے نتیجہ میں اس سے مقصود اصلاح وتربیت نظامِ تعلیم کا حصہ ہی نہیں رہ گئی ، اور نتیجۃً کہ تلاوت ،تعلیم اور تزکیہ جو مجموعی طور پر بنیادی اور ضروری مقصد قرار پایا تھا اس کی نامناسب تقسیم ہوگئی، اور اکثریت تزکیہ سے محروم ہوگئی ،علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے:

''اور وہ مسجد نبوی جس میں یہ دونوں جلوے یکجا تھے ، اس کی تجلیات مدرسوں اور خانقاہوں کے دو حصوں میں منقسم ہوگئی ،جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدارس سے علماء دین کی جگہ علماء دنیا نکلنے لگے اور باطن کے مدعی علم شریعت کے اسرار وکمالات سے جاہل ہو کر رہ گئے''۔

بلکہ اب تو غضب یہ ہے کہ مدرسہ الگ ہے، خانقاہ الگ ہے، مسجد الگ ہے، انتظامی اعتبار سے اگر ایسا ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ شریعت کی روح ، ایمان کی روشنی اور وروح کی تقویت وتربیت کا سامان ان تینوں جگہ موجود ہونا چاہئے ،ضروری ہے کہ ان تینوں جگہوں کا آپسی ربط اس طرح ہو کہ مسجد نبوی کا اسوہ سامنے آئے ،مسجد فرض نماز کے لیے خاص ہے، اس کے اپنے حکامات ہیں ،لیکن اس کی خاص حیثیت کے علاوہ کسی تفریق کا روا رکھنا درست نہیں ،علم کی محفلیں ، درس کے حلقے، خدا کی معرفت کے جلوے، نبیؐ کی سیرت کے تذکرے اور تعلیم وتربیت کا سامان تینوں جگہ یکساں طور پر موجود ہونا چاہئے ،اس جامعیت کے قرآن کی روشنی میں تزکیہ کی ضرورت ہے، قرآن سے دوری اختیار کر کے ، سیرت نبوی سے عدم واقفیت کے ساتھ کوئی اگر انسان کامل ہونے کا دعویدار ہے تو اس کا دعوی فضول ہے ،اس لیے کہ قرآن مجید اور نبی کی سیرت وسنت ہی اس دین کا قوام ہیں، حضور ﷺ نے خود فرمایا ہے کہ تم اس وقت تک گمراہ نہیں ہو سکتے جب تک کتاب اللہ اور میری سنت کو لازم پکڑو گے، خود آیت بالا میں حکمت سے مراد آنحضرت ﷺ کی سنت بھی لی گئی ہے، کیونکہ آپ نے جو تشریحات قول وعمل سے فرمائی ہیں وہی وہ دانائی و دانشمندی کی باتیں ہیں جنہیں حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ہمارا معاشرہ اس وقت سسک رہا ہے، اور اس کے سسکنے کی اور کراہنے کی دو وجہیں ہیں ، ایک طرف وہ طبقہ ہے ، جو تزکیہ کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا ،جس کے نتیجہ میں فساد و کرپشن ہر عمل میں موجود ہے ،تعلیم کتاب یعنی قرآن فہمی کے لیے کسی معلم کی ضرروت نہیں محسوس کرتا بلکہ احادیث نبویہ سے بھی بے اعتنائی برتتا ہے، اسی وجہ سے ایسے ایسے اجتہادات وجود میں آتے ہیں کہ امت کی توانائی کا بڑا حصہ صرف دفاع میں لگتا رہتا ہے، اس کے بالمقابل انتہا پسندی کی دوسری صورت یہ ہے کہ ایک بڑے طبقہ کا قرآن وسیرت سے تعلق ہی نہیں ،ان کے نزدیک اپنے اپنے مقتدا و پیشوا کے فرمان کی حیثیت گویا منزل من اللہ ہے ،قرآن مجید کی تعلیمات میں تحقیق کا حکم دیا گیا ہے مگر یہ لوگ بغیر کسی تحقیق کے کسی بھی رہزن دین وایمان کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیتے ہیں اور اسی کی اتباع کر سب کچھ سمجھنے لگتے ہیں، وہ دیکھتے ہی نہیں کہ وہ جس کی اتباع کر رہے ہیں وہ انہیں کس رخ پر لے جا رہے ہیں ،بعض خود ساختہ مشائخ کو دیکھ کر حیرت واستعجاب کی انتہا نہیں رہتی کہ ان کے یہاں دنیا بھر کے واقعات اور معلوم نہیں کیا کیا لوگوں کو سکھایا اور بتایا جاتا ہے، مگر براہ راست قرآن وسیرت کے

ذریعہ ان کے تزکیہ کی فکر نہیں ہوتی۔

قرآن مجید ان دونوں انتہا پسندی کے درمیان ہماری رہنمائی کرتا ہے اس کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ اتَّقُواْ اللّهَ وَكُونُواْ مَعَ الصَّادِقِيْن(التوبه : ۱۱۹)

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور راست بازوں کے ساتھ رہو۔

اس ہدایت پر غور کیجئے تو واضح ہو جائے گا کہ اپنی دینی ضرورت و تربیت کے لیے علماء حق اور صادقین کے ساتھ رہنے اور ان سے استفادہ کرنے کی ہدایت ہے، علماء حق اور صادقین کی شرط اس لئے ہے کہ جو چاہے وہ بھیس بدل کر بے جا تاویلات کے ذریعہ اور غیر شرعی خرق عادت واقعات سنا کر امت کو گمراہ نہ کر سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تزکیہ فلاح انسانی اور اخروی اعتبار سے اس کی نجات و ترقی کا باعث ہے، دنیاوی زندگی میں اللہ کا مخلص ہونے کے لیے تطہیر کے عمل سے گزرنا، اللہ کی مرضی کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا اور اپنے نفس پر قابو پانا ہی تزکیہ ہے ،تزکیہ کا مقصد ہے کہ دین کو دنیا پر، اور دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی پر ترجیح دی جائے، قرآن کا ارشاد ہے:

قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّى (۱۴) وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى(۱۵) بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا(۱۶)وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَى(۱۷) (الاعلیٰ)

ترجمہ: یقیناً وہ شخص کامیاب ہے جو پاکیزگی اختیار کرنے والا ہے، جو اپنے رب کا نام لے کر نماز پڑھتا ہے، (جس کی عبادت تزکیہ کے لیے ہوتی ہے، اور زندگی پاکیزگی کے ساتھ گزرتی ہے) لیکن اے انسانو! تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، حالانکہ آخرت ہی بہتر ہے اور وہی ہمیشہ رہنے والی ہے۔

دوسری جگہ قرآن کہتا ہے:

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا(۷)فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا(۸) قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا (۹)وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا (۱۰) (الشمس)

ترجمہ: قسم ہے ہر اس شخص کی اور اس کی مکمل تخلیق کی، پھر (یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ) اللہ نے اس میں اس کے فجور اور تقوی کی صلاحیت رکھ دی ہے، یقیناً وہ کامیاب ہوتا ہے جو نفس کا تزکیہ کرتا ہے، اور وہ ناکام و نامراد ہوتا ہے جو اس کو ملیا میٹ کرتا ہے (برائیوں میں ملوث ہوتا ہے۔)

تزکیہ کا مقصد ہے کہ انسان اللہ کے لیے خالص و مخلص ہو جائے:

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاء وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَة. (البينة : ۵)

ترجمہ: حالانکہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی مخلصانہ اطاعت کرتے ہوئے اس کی بندگی کریں، ہر طرف سے کٹ کر اس کے لیے یکسو ہو جائیں، اور نماز صحیح طور پر ادا کریں، اور زکوۃ دیں، اور یہی صحیح اور درست طریقۂ اطاعت ہے۔

پھر تطہیر کے عمل سے گزرتے ہوئے ہدایت کے اس مقام پر جا پہنچے کہ اسے صفت احسان حاصل ہو جائے، اسے خدا تعالی کا استحضار رہے، وہ اپنے آپ کو خدا کے سامنے حاضر سمجھنے لگے، ہر قدم پر یہ تصور رہے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے، حدیث جبرئیل کے الفاظ میں " **أن تعبد الله كأنك تراه فإن لم تكن تراه فإنه يراك**". (مسلم،۱/۹۳)

بدقسمتی سے آج مقصد اساسی تو فوت ہو گیا مگر بہت سے لوگوں نے چند رسومات و روایات کا نام تزکیہ سمجھ لیا، حالانکہ اگر معاملات میں صفائی نہ ہو، جھوٹ، فریب، حیلہ بازی، مکر و دغا

سے نفرت نہ ہو اور حرام مال سے تنفر نہ ہو، دنیا کی محبت دل سے نہ نکلے تو پھر تزکیہ کے کیا معنی، تزکیہ نام ہے اللہ پر مکمل اعتماد کا، نبی کے طریقہ پر فریفتگی وشیفتگی کا، تقوی طہارت اور پاکبازی و پاکدامنی کا، حق بات کہنا، حق کی حمایت کرنا، حق کے لیے تڑپنا، حق پر جمنا، باطل سے نفرت ہونا، تخلق باخلاق اللہ سے متصف ہونا وغیرہ مزکیٰ مجلیٰ انسان کی علامتیں ہیں، دنیا سے بے رغبتی ہونا، توبہ وانابت اور رجوع الی اللہ، امانت داری، وفاداری، عجز وانکساری تزکیہ کے مظاہر ہیں۔

جب انسان ان صفات سے متصف ہوتا ہے تو پھر بتدریج وہ اپنی اصلاح، اور معاشرے کی اصلاح کا سبب بنتا ہے، اس کے سامنے لوگوں کی اصلاح، لوگوں کے درمیان صلح صفائی کی نبوی ہدایت ہوتی ہے، تعاونوا علی البر والتقوی کا قرآنی اصول ہوتا ہے، اس پر عمل کرتے ہوئے پھر وہ اس گروہ سے جاملتا ہے جس کا تذکرہ قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے:

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُوْلَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُون. (ال عمران: ۱۰۴)

ترجمہ: تمہیں ایک ایسی امت ہونا چاہئے جو خیر کی دعوت دے، اور بھلائی کی تلقین کرے اور برائیوں سے روکے، اور ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں۔

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ انسان کو اپنے نفس پر قابو پانے کے لیے مجاہدہ کی ضرورت پڑتی ہے، مجاہدۂ نفس کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے اور احادیث نبویہ میں بھی، مجاہدۂ نفس کا سیدھا سا مفہوم یہ ہے کہ اس کو معصیت خالق سے باز رکھا جائے، اور اطاعت الٰہی پر مجبور کیا جائے:

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَى (۴۰) فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَى (۴۱) (النازعات)

ترجمہ: اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا، اور نفس کو خواہشات سے روکتا رہا، تو جنت اس کا ٹھکانہ ہوگی۔

حدیث نبوی کے مطابق نفس کا مجاہدہ ہی اصل جہاد ہے، ابن قیمؒ نے مجاہدۂ نفس کے چار مراتب بیان کیے ہیں جو فی الحقیقت قرآن وسنت سے مستفاد ہیں:

۱۔ مجاہدہ نفس کا پہلا مرتبہ یہ ہے کہ اس کو ہدایت کی تلاش اور دین حق کو سیکھنے پر مجبور کیا جائے۔

۲۔ دوسرا مقام مجاہدہ کا یہ ہے کہ اس کو حصول علم کے بعد اس پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے۔

۳۔ مجاہدہ کا تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ نفس کو دعوت حق پر مجبور کیا جائے۔

۴۔ نفس کے جہاد کا چوتھا درجہ یہ ہے کہ راہ دعوت کی تکلیفیں برداشت کی جائیں، مخلوق کی طرف سے ملنے والے مصائب پر صبر کیا جائے اور یہ سب اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے۔ (زادالمعاد ج۲/ ۵۸)

مجاہدۂ نفس کے لیے ضروری ہے کہ محاسبۂ نفس کی عادت ڈالی جائے جس کی قرآن سنت میں تلقین کی گئی ہے، آج کا المیہ یہ ہے کہ دوسروں کے حال پر نظر ہوتی ہے مگر خود اپنی خبر نہیں ہوتی، احتساب کائنات تو ہوتا ہے مگر احتساب نفس کی فرصت نہیں ہوتی، جب احتساب کی مطلوب ترتیب ہی الٹ جاتی ہے تو پھر اجتماعی طور پر جن ثمرات وفوائد کی امت کو ضرورت ہے ان کا بارآور ہونا یقیناً مشکل ہے، قرآن مجید کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ. (الحشر: ۱۸)

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور ہر شخص کو دیکھنا چاہئے کہ اس نے کل (آخرت) کے لیے کیا تیاری کر رکھی ہے، اور اللہ کا لحاظ رکھو، بے شک اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

صحابہ کرام کا حال یہ تھا کہ اپنے اعمال واقدامات کے سلسلہ میں بڑے حساس رہتے، اپنا محاسبہ کرتے رہتے، ذرا جو غفلت ہوتی تو بعض حضرات کو اپنے اندر نفاق کا شائبہ ہونے لگتا (مسلم: ۲۷۵) ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے نفس کا احتساب کرنے والوں کو عقلمند فرمایا ہے (ترمذی: ۲۵۷۷) حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا کہ اپنا حاسبہ کرو اس سے پہلے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے: "حاسبوا أنفسكم قبل أن تحاسبوا ، وزنوا انفسكم قبل ان توزنوا، فإنه أهون عليكم فى الحساب غدا، أن تحاسبوا أنفسكم اليوم وتزينو للعرض الأكبر "يومئذ تعرضون لا تخفى منكم خافية". (نضرة النعيم ۸/ ۳۳۲۲)

جب تک انسان اپنے آپ کو خود احتسابی کا عادی رکھتا ہے، اپنا محاسبہ کرتا رہتا ہے اسے خیر کی توفیق ہوتی رہتی ہے، بغیر محاسبہ نفس کے صلاح قلب کا امکان ہی نہیں، محاسبۂ نفس سے کوئی بری نہیں، ہر عام وخاص اور مثقف وغیر مثقف کو اس کی عادت ڈالنا چاہیے، یہی محاسبہ ہے جس کے ذریعہ دنیا وآخرت کی سعادت حاصل کی جاسکتی ہے، ترقی کے مدارج طے کئے جا سکتے ہیں، اللہ کی محبت اور اس کی رضا حاصل کی جاسکتی ہے، جس کو احتساب کی عادت ہے گویا اس میں خوف الٰہی موجود ہے، اور جسے خوف خدا کی نعمت حاصل ہے گویا وہ منزل مقصود تک پہنچ جائے گا، اگر یہ محاسبہ کی صفت باقی نہ رہ جائے تو پھر صلاح کا باقی رہ پانا ممکن نہیں، جس فرد میں محاسبہ نفس کی خُو نہ ہو وہ کمال تک نہیں پہنچ سکتا، جس معاشرہ، ادارہ اور حکومت میں احتساب کا جواز نہ ہو اس کا اپنی صلاح وافادیت کا کھو دینا لازمی امر ہے، آج ہمارے معاشرے اور ملت کے فساد کی بڑی وجہ خود احتسابی کا فقدان ہے، اسی طرح اجتماعی طور پر ملت کے زوال کا سبب اکبر احتساب کا مفقود ہو جانا ہے، خود احتسابی کا فقدان مردہ قوم کی علامت اور زندہ قوم کے لیے سم قاتل ہے۔

ضرورت اس کی ہے کہ امت کا رشتہ قرآن وسیرت نبوی سے جوڑا جائے، قرآن کی روشنی میں تزکیہ کا فریضہ انجام دیا جائے، قرآن کی دعوت کو عام انسانوں میں پھیلایا جائے، قرآن کی کشش و جاذبیت کے ذریعہ عقل و دل کو مسحور کیا جائے، یاد رکھا جائے کہ رسول کریم ﷺ کی دعوت کا آغاز قرآن مجید کی تلاوت وتعلیم سے ہوا تھا، پورے عہد مکی میں آپ کو سوائے جہاد بالقرآن کے کسی اور امر کی اجازت نہ تھی، آپ ﷺ کو صراحت کے ساتھ جہاد بالقرآن کا حکم دیا گیا تھا:

فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِيْنَ وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَاداً كَبِيْراً. الفرقان : ۵۲)

ترجمہ: بہر حال آپ کافروں کے دباؤ میں مت آئیں، اور قرآن کے ذریعہ ان سے زبردست جہاد کریں۔

ذرا کبھی اس کا بھی محاسبہ ہونا چاہئے کہ کیا قرآن کریم کے الفاظ ومعانی اور اس کے احکام کی تبلیغ وتعلیم کا حق ادا کر دیا گیا؟ کیا اس کی دعوت کے لیے تمام وسائل استعمال کر لیے گئے اور اس کو دنیا کے انسانوں تک پہنچا دیا گیا جس کا حکم دیا گیا ہے؟ اور جو وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَاداً كَبِيْراً کا مقصود ومنطوق ومدلول ہے؟ کہ قرآن کی دعوت اور اس کے احکام کی تبلیغ میں کوئی کسر نہ رکھ چھوڑی جائے کوئی موقع نہ چھوڑا جائے، کوئی وسیلہ باقی نہ رہ جائے یہاں تک کہ اتمام حجت ہو جائے، قرآن مجید خود دعوی بھی ہے اور دلیل بھی، جب بھی اس کو اپنی تاثیر دکھانے کا موقع ملتا ہے تو وہ مؤثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، ضرورت ہے کہ اس کو اپنے منصوبوں کا حصہ بنایا جائے اور ہر ہر انسان

تک اس کو پہنچانے کی سعی تمام کی جائے۔

ہم نے اس رسالہ میں قرآن مجید کی ان آیات کو امت تک پہنچانے کی ایک ناقص وناتمام کوشش کی ہے جن میں مومنین کاملین کی علامت کا تذکرہ ہے، اللہ کے مقرب بندوں کی صفات وخصوصیات کا بیان ہے، ان آیات کی روشنی میں اپنا مکمل تزکیہ ممکن ہے، اگر یہ آیات ہر فرد بشر کی زندگی میں شامل ہو جائیں اور ہر شخص ان پر عامل ہوجائے تو ایک بہترین معاشرہ اور پاکبازی انسانوں کی ایک صالح جماعت کا وجود عین ممکن ہے جس کی تشکیل خود قرآن مجید چاہتا ہے اور جس کے لیے نبی پاک علیہ السلام مبعوث کئے گئے۔

اس رسالہ (۱) کے مضامین میں آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ قرآن مجید کیسے سیدھے سادے انداز میں فلاح حقیقی کے نسخے بیان کرتا ہے، کتنے پرکشش انداز میں اپنا مقرب بننے کے لیے انتہائی سہولت کے ساتھ ان خصوصیات کا تذکرہ کرتا ہے جن سے متصف ہوکر انسان اللہ کا مقرب بندہ بن جاتا ہے، اس کا محبوب ہوجاتا ہے، اور جو خدا کی نظر میں محبوب ہوجاتا ہے تو اس سے فرشتے بھی محبت کرنے لگتے ہیں اور انسانوں میں بھی اس کی مقبولیت کی فضا سازگار وہموار ہوجاتی ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ وُدّاً (مریم: ۹۶)

ترجمہ: جولوگ مومن ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں، رحمٰن ان کو محبوبیت سے نوازے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ آیات ہمارے لیے آئینہ ہیں، معیار ہیں، ہم ان کی روشنی میں اپنے روز وشب کا جائزہ لے سکتے ہیں، اپنے اعمال کو دیکھ سکتے ہیں، اپنے کردار کو پرکھ سکتے ہیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں، کس مقام پر ہیں، ہمارے اعمال کیسے ہیں، ہمارا شمار مقربین میں ہے، عام مسلمانوں میں ہے، یا ہم خدا کے دشمنوں جیسے ہیں، اس جائزہ کے بعد ہم اپنا محاسبہ کرتے ہوئے آگے بڑھ سکتے ہیں:

لَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَاباً فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُون. (الانبیاء: ۱۰)

ترجمہ: اور ہم نے تمہیں وہ کتاب دی ہے جس میں تمہارے لیے سامان نصیحت ہے، کیا تم عقل وشعور سے کام نہیں لیتے۔

ہمیں کسی کمال کا دعوی نہیں، یہ محض ہماری ایک طالب علمانہ کوشش ہے، خطا ونسیان کا ہمہ وقت امکان ہے، اصلاح اور تعلق بالقرآن کے لیے یہ ایک کاوش ہے، اگر اس میں کوئی خوبی ہو تو وہ محض خدا تعالیٰ کے فضل سے ہے اور اگر کمی وکوتاہی ہو تو اس میں صرف میرا قصور ہے، اس پر تنبیہ کی گزارش ہے۔

میں نے ان آیات کا انتخاب اس لیے کیا کیونکہ ان میں بڑی جامعیت ہے اور اجمالی طور پر ان میں تمام محاسن وکمالات، مومنین کاملین کی خصوصیات اور مقربین کی صفات کو بیان کردیا گیا ہے، تیسرے مضمون میں بعض دیگر ضروری چیزیں آگئی ہیں، آیات کا ترجمہ استاد محترم مولانا سید سلمان حسینی ندوی حفظہ اللہ کے ترجمہ قرآن سے نقل کیا گیا ہے، اس لیے کہ جب سے مولانا محترم کا ترجمہ آیا ہے، راقم اپنی تحریروں میں اسی سے استفادہ کرتا ہے، کیوں کہ راقم کے نزدیک قرآن کریم کی یہ ترجمانی روح قرآن سے قریب اور کامیاب ترین ترجمانی ہے، اللہ رب العزت سے دعاء ہے کہ اس کاوش کو راقم سطور کے لیے توشۂ آخرت بنائے، تعلق بالقرآن کا ذریعہ بنائے، اس کے ذریعہ مطالعہ قرآن، مطالعہ سیرت اور قرآن وسنت پر عمل کو فروغ دے، اور اسکے نتیجہ میں راقم کی مغفرت کا سامان کردے۔

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

☆☆☆

(۱) بقیہ ۳ رقسطیں اس رسالہ کی حسب ترتیب آئندہ ملاحظہ فرمائیں۔

❑ اصلاح حیات

قتل؛ ایک سنگین جرم اور گناہِ کبیرہ

عبدالرشید طلحہ نعمانی

امیر المومنین فی الحدیث امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری(194-256/870) اپنی صحیح میں معروف صحابیٔ رسول، حفظ وکتابتِ حدیث میں مشہور حضرت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ وقت بھی آنے والا ہے جب زمانے ایک دوسرے کے قریب ہوں گے، علم اٹھالیا جائے گا، فتنے پھوٹ پڑیں گے، بخل ڈالا جائے گا اور ہرج زیادہ ہوگا۔ صحابہؓ نے یہ سن کر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ''ہرج'' کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''قتل وغارت گری''۔

حدیث بالا کی روشنی میں جب ہم اپنے ماحول پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں، گردوپیش کا سرسری جائزہ لیتے ہیں اور روزمرہ پیش آنے والے واقعات کو پڑھتے یا دیکھتے ہیں تو صاف طور پر محسوس ہوتا ہے کہ ان دنوں قتل وخونریزی کی وباسب سے زیادہ عام ہے، دنیا کی چند کوڑیوں یا مختصر سی زمین وجائیداد کے لیے کسی کو قتل کر ڈالنا معمول بن چکا ہے۔ چھوٹی چھوٹی بات کو لے کر باپ بیٹے سے، بھائی بھائی سے، شوہر بیوی سے اور پڑوسی پڑوسی سے آمادۂ پیکار ہے۔ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جارہا ہے انسانیت مٹتی جارہی ہے، مروت مائل بہ زوال ہے، قرابت کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی، بے لوث دوستی کا تصور بھی محال ہو چکا ہے، انسانی جان تو مچھر اور مکھی سے بھی کم تر وحقیر ہوگئی ہے۔ آئے دن بوری بند لاشیں مل رہی ہیں، روزانہ درجنوں قتل ہو رہے ہیں اور سفاک درندے ہر طرف دندناتے پھر رہے ہیں؛ مگر حیف صد حیف کسی کو احساس زیاں نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جب معاشرے میں ایک دوسرے کی جان کا احترام نہیں رہے گا تو تمدن کی جڑیں کھوکھلی ہو جائیں گی، بدامنی وانارکی پھیل جائے گی اور ظلم وسرکشی کا ہر سمت بول بالا ہوگا۔ یہ وہ نکتہ ہے جو سورۃ المائدۃ میں ہابیل اور قابیل کے واقعے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ: جس کسی نے ایک انسان کی جان بھی جان کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا لی تو اس نے گویا پوری نوعِ انسانی کو قتل کر دیا' اور جس نے ایک انسان کو زندگی دی (اس کی جان بچائی) اس نے گویا پوری نوعِ انسانی کی جان بچائی''؛ اس لیے کہ حقیقتاً قتل ناحق انسانی تمدن کی جڑوں کو کاٹتا ہے۔

رواں ہفتے اخبارات اور سوشل میڈیا میں یہ لرزہ خیز خبر سرخی بنی رہی کہ لاک ڈاؤن میں نرمی کے بعد حیدرآباد شہر کے مختلف علاقوں؛ بل کہ مسلم اکثریتی محلوں میں قتل کی وارداتیں بڑھتی جارہی ہیں، صرف ایک دن میں علانیہ طور پر بہیمانہ قتل کے چار چار واقعات نے لوگوں کو خوف وہراس میں مبتلا کر دیا ہے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ان ناحق خون ریزی کرنے والوں کی شناخت مسلم ناموں کے ذریعہ کی گئی ہے۔ یہ کس درجہ حیرت کا مقام ہے کہ وہ دین جو دنیا میں سراپا عدل انصاف اور پیام امن بن کر آیا تھا، وہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) جو رحمۃ اللعالمین بنا کر بھیجے گئے تھے اور

وہ صحابہ رضی اللہ عنہم جو محبت اور شفقت سے نوع انسانی کی خدمت کے خوگر تھے اب انہی کے نام لیوا ایسے ایسے مظالم ڈھا رہے ہیں اور ظلم و بربریت کا وہ شرم ناک مظاہرہ کر رہے ہیں، جن کے ذکر سے کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔

قرآن وحدیث کی تعلیمات اور فطرت انسانی میں غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس درندگی وخوں ریزی کے پیچھے براہ راست یا بالواسطہ تین عوامل کارفرما ہیں، اور یہ تینوں عوامل وہی ہیں، جن کی جڑ سے عموماً تمام انسانی کمزوریاں جنم لیتی ہیں، اور انسانیت کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں، آپ انسانی جرائم کی تاریخ پڑھ ڈالئے سب کی تہ میں عموماً یا تو ''شہوتِ بطن'' کا جذبہ ہوگا یا ''نفسانی خواہشات'' کا یا پھر ''عزت وجاہ'' کی حد سے بڑھی ہوئی ہوس کا۔

خون مسلم کی حرمت:

اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک مومن کے جسم و جان اور عزت وآبرو کی اَہمیت خانۂ کعبہ سے بھی زیادہ ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مومن کی حرمت کو کعبے کی حرمت سے زیادہ محترم قرار دیا ہے۔ امام ابن ماجہؒ (207-275ھ/ 824-887ء) نقل کرتے ہیں، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خانہ کعبہ کا طواف کرتے دیکھا اور یہ فرماتے سنا: (اے کعبہ!) تو کتنا عمدہ ہے اور تیری خوشبو کتنی پیاری ہے، تو کتنا عظیم المرتبت ہے اور تیری حرمت کتنی زیادہ ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے! مومن کے جان و مال کی حرمت اللہ کے نزدیک تیری حرمت سے زیادہ ہے اور ہمیں مومن کے بارے میں نیک گمان ہی رکھنا چاہئے۔

امام ترمذیؒ (209-279ھ/ 825-892ء) اپنی جامع میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے منقول یہ حدیث ذکر کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مسلمان شخص کے قتل سے پوری دنیا کا ناپید (اور تباہ) ہو جانا ہلکا ہے۔

مشہور محدث امام بیہقیؒ (384-458ھ/ 994-1066ء) حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما کے حوالے سے ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر تمام اہل زمین اور تمام اہل آسمان ایک مومن کے قتل ناحق میں شریک ہو جائیں تو بھی اللہ تعالیٰ سب کو جہنم میں جھونک دیں گے۔ ظاہر ہے کہ آسمان جس برگزیدہ اور معصوم مخلوق سے معمور ہے کون نہیں جانتا۔ اور زمین کی پشت پر کیسی کیسی مقدس ہستیاں آباد ہیں، کیا ان کے بارے میں کبھی قتل مومن کا وسوسہ بھی آسکتا ہے؛ لیکن مومن کی جان کی عظمت ایسی ہے کہ اس کا بیان بجز اس تعبیر کے اور کس طرح کیا جاسکتا ہے؟

قتل ناحق کی مذمت قرآن وحدیث کی روشنی میں:

قرآن وحدیث میں متعدد مقامات پر مختلف پیرایے میں اس امر کی وضاحت کی گئی کہ اسلام میں انسانی جان علی الاطلاق محترم ہے۔ صرف مسلمانوں کی کوئی تخصیص نہیں؛ بلکہ ہر ذی روح کی جان کا احترام ضروری ہے، نہ تو کسی جاندار کو بلاوجہ مارنے کی اجازت ہے اور نہ ایذا رسانی کی۔ اس حوالے سے ذیل میں چند آیات وروایات ملاحظہ فرمائیں!

حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں: ترجمہ: اور جو شخص کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے۔ جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اللہ اس پر غضب نازل کرے گا اور لعنت بھیجے گا اور اللہ نے اس کے لیے زبردست عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (النساء)

ایک اور جگہ ارشاد باری ہے: ترجمہ: اور جس جان کو اللہ تعالیٰ نے حرمت عطا کی ہے، اسے قتل نہ کرو؛ مگر یہ کہ تمہیں (شرعاً) اس کا حق پہنچتا ہو اور جو شخص مظلومانہ طور پر قتل ہو جائے تو ہم نے اس کے ولی کو (قصاص کا) اختیار دیا ہے، چناں چہ اس پر لازم ہے کہ وہ قتل کرنے میں حد سے تجاوز نہ کرے، یقیناً وہ اس لائق ہے کہ اس کی مدد کی جائے۔ (الاسراء) ایک اور مقام پر تنبیہ خداوندی

ہے: ترجمہ: اور جو اللہ کے ساتھ کسی بھی دوسرے معبود کی عبادت نہیں کرتے اور جس جان کو اللہ نے حرمت بخشی ہے اسے ناحق قتل نہیں کرتے اور نہ وہ زنا کرتے ہیں اور جو شخص بھی یہ کام کرے گا اُسے اپنے گناہ کے وبال کا سامنا کرنا پڑے گا، قیامت کے دن اس کا عذاب بڑھا کر دوگنا کر دیا جائے گا اور وہ ذلیل ہو کر اس عذاب میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ (فرقان)

اسی طرح رحمۃ للعالمین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ناروا قتل پر سخت وعیدیں ارشاد فرمائی ہیں اور اس گناہ کبیرہ سے باز رہنے کا حکم فرمایا ہے۔ حضرت انسؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ قول نقل فرمایا ہے: کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑے گناہ یہ ہیں: اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور کسی انسان کو قتل کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا اور جھوٹی بات کہنا۔ (بخاری) ایک جگہ تو قتل ناحق کو کفر قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: کسی مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اسے قتل کرنے کے لیے لڑنا کفر ہے"۔ (بخاری) حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر گناہ کے بارے میں امید ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو معاف فرما دے، سوائے اس شخص کے جو مشرک ہونے کی حالت میں مرا ہو، یا جس نے کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کیا ہو۔ (مجمع الزوائد) حضرت عبداللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص دوسرے کے پاس جا کر اسے قتل کر دے تو مقتول جنت میں ہوگا اور قاتل جہنم میں۔ (مجمع الزوائد) قتل کی سنگینی کے باعث اسلام نے اسلحہ کے ذریعے مذاق، اور اسلحہ کی نوک سے کسی معصوم کی طرف اشارہ کرنے سے بھی منع فرما دیا، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی بھی اپنے بھائی کی طرف اسلحہ سے اشارہ نہ کرے؛ کیونکہ اسے نہیں معلوم کہ شیطان اس کے ہاتھ کو چوک لگا دے، اور وہ جہنم کے گڑھے میں جا گرے۔ (بخاری و مسلم) نیز نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا: جو شخص اپنے کسی بھائی کی طرف خنجر سے بھی اشارہ کرے تو فرشتے اس پر لعنت بھیجتے ہیں، چاہے وہ اس کا سگا بھائی کیوں نہ ہو۔ (مسلم، ترمذی)

حرفِ آخر:

مختصر یہ کہ قتل کے ان پیہم واقعات کا رونما ہونا قوتِ برداشت کے فقدان، غصے میں آپے سے باہر ہو جانے اور اسلامی تعلیمات سے جہالت و ناواقفیت کا نتیجہ ہے جو مسلم معاشرے کے لیے کسی بدنما داغ سے کم نہیں۔ اخیر میں ایک صاحب دل اہل قلم کی تحریر کے اس اقتباس پر بات ختم کرتے ہیں:

موجودہ حالات میں اہل اسلام کا فرض تھا کہ اپنے انفرادی واجتماعی اختلافات کی پستی سے ذرا اوپر اُٹھتے اور وحدتِ اسلام کی رسی تھام کر دوسروں کو سر توڑ جواب دیتے، نہ سہی یہ کہ دوسروں کو اپنے حلقہ میں لے لیتے، یہ تو ہوتا کہ دوسروں کو اپنے حصار میں فاتحانہ داخل نہ ہونے دیتے؛ لیکن کسی اور کو کیا کہئے اور کس منہ سے کہئے، جبکہ خود اپنوں نے یہ وحدت پارہ پارہ کی، خود اپنا حصار انہوں نے توڑا، جس ملت کے قانون میں عام انسانوں کی زندگی کی ضمانت تھی، آج اسی کے ہاتھ ایک دوسرے کے گلا گھونٹنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں پر کیا نظر اُٹھائیے جنھیں خدا سے سروکار نہیں، آخرت سے وہ غافل ہیں، جنت وجہنم کو صرف خوش فہمی سمجھتے ہیں، جن کے نزدیک "مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" ہی سب کچھ ہے، وہ اگر ایک دوسرے کی گردنیں کاٹیں تو عین ممکن ہے کیونکہ ان کے سامنے اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کا نقشہ نہیں ہے؛ لیکن جس قوم کا ایمان یہ ہو کہ یہ دنیا ایک رہ گزر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی پھر جونہی آنکھیں بند ہوگی اپنے مالک و مولیٰ کے حضور اپنے کئے دھرے کا کچا چٹھا پیش کرنا ہے، اسے کیسے جرات ہوتی ہے کہ جس کام کو اسی مالک نے جس مالک کے سامنے بالآخر حاضری ہے، جرم اور بدترین جرم قرار دیا ہے، اسی کے ارتکاب کی جرات کر بیٹھے۔" (قتل ناحق)

☆☆☆

❑ اصول تحریر

کہیں ہماری تحریر ہمارے حظِ نفس کا ذریعہ تو نہیں؟

محمد فرید حبیب ندوی

تحریر کا فن بڑا نازک فن ہے۔ جی ہاں! یہ ایک فن ہے، جو مسلسل مشق کرنے سے آتا ہے۔ چند الفاظ وکلمات ملا کر جملے بنانے اور چند جملے بنا کر مضمون بنا دینے سے، کہیں اونچا ہے لکھنے کا فن۔ اس فن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ ظاہر یہ ہے کہ جملوں کی ساخت اچھی ہو، تراکیب کا استعمال عمدہ ہو اور غیر فصیح الفاظ کے استعمال سے احتراز کیا جائے۔ باطن یہ ہے کہ تحریر مقصدیت سے پُر ہو۔ قلم کار، اپنے قارئین کو کوئی پیغام دینا چاہ رہا ہو۔ اس کے دل میں اپنے قارئین کے تئیں ہمدردی ومحبت کے جذبات ہوں۔ اس کی تحریر منصفانہ اور غیر جانب دار ہو۔ اگر وہ کسی مسئلے کا تجزیہ پیش کر رہا ہے تو اس کا قلم صفحہ قرطاس پر اپنے دل کے بولے نہ پھوڑ رہا ہو؛ بلکہ وہ انصاف رقم کرے۔ اس کی تحریر سے اس کے دل کا درد اور اندرون کی بے چینی نظر آتی ہو۔ اور اقبال کے الفاظ میں اس کی تحریر خونِ جگر کی آئینہ دار ہو۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ اگر اس کی تربیت صحیح خطوط پر نہ کی گئی ہو تو اسے دوسروں کو کوسنے میں مزہ آتا ہے۔ دوسروں پر بھڑاس نکال کر اسے سکون ملتا ہے اور دوسروں کی تنقید وتنقیص سے اس کے مردہ دل کی تسکین ہوتی ہے۔ چنانچہ اس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے اہل قلم صرف اس لیے لکھتے ہیں کہ انھیں لکھنے میں مزہ آتا ہے۔ وہ تجزیہ وتنقید ایسے اسلوب میں کرتے ہیں، جو ان کے دل کی پیاس بجھا دے اور ان کی آتشِ غضب کو ٹھنڈا کر دے۔ وہ اپنے مخالفین کے لیے ایسے جلے بھنے لہجے میں لکھتے ہیں کہ یہ تو ہوسکتا ہے کہ اس سے ان کے نفس کو تسکین مل جائے، مگر یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ ان کی تحریر کوئی دیرپا نقش قائم کر پائے۔ لکھنے کا یہ اسلوب اِس وقت خاص کر ہم ان اہل قلم کے یہاں پاتے ہیں جو ترکی یا سعودی کی موافقت ومخالفت میں لکھتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب ترکی کی حمایت میں لکھنے والے قلم اٹھاتے ہیں تو اپنے مخالفین کو کوسنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑتے۔ اسی طرح جب ترکی کے مخالفین قلم سنبھالتے ہیں تو ان کا قلم بھی اپنے حریفوں کے لیے شعلہ باری سے کم پر تیار نہیں ہوتا۔ یہی حال سعودیہ کی حمایت ومخالفت میں لکھنے والوں کا نظر

آتا ہے۔ بادی النظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والا، اپنے دل کی آگ بجھانا چاہ رہا ہے۔ اسے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ اس کی تحریر منصفانہ رہے گی یا اس میں ناانصافی کا عنصر شامل ہوجائے گا۔ اسے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ عام قاری پر (جو نہ اس کا ہم خیال ہے، نہ اس کا مخالف) اس کی تحریر سے کیا اثر پڑے گا۔ وہ اسے پڑھ کر لکھنے والے کے بارے میں اچھا تاثر قائم کرے گا یا برا۔ اس وقت قلم کاروں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہی ہے جو بس اس لیے لکھتی ہے کہ دوسروں کو برا بھلا کہہ کر اسے سکون مل جائے۔ اس اندازِ فکر کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ لوگ اس طرح کے کسی واقعے کے انتظار میں رہتے ہیں جب انھیں اپنے دل کے بولے پھوڑنے کا موقع ملے۔ بسا اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اگر کوئی واقعہ امت مسلمہ کے مفاد کے خلاف ثابت ہونے والا ہو اور کسی صاحب قلم نے پہلے ہی اس کی پیش گوئی کردی ہو، اور اتفاق سے ایسا ہی ہوجائے تو اسے جتنی خوشی اس بات کی ہوتی ہے کہ اس کی پیشن گوئی درست ثابت ہوئی، اتنا غم اِس کا نہیں ہوتا کہ اس واقعے کا امت پر کیا اثر پڑ رہا ہے یا مستقبل میں کیا پڑنے والا ہے۔

مگر کیا کیجئے کہ اس وقت اکثر لکھنے والے اسی قبیل سے ہیں، ہر ایک قلم کار کا اپنے قارئین کا ایک حلقہ ہوتا ہے، وہ بس اپنے حلقے کو خوش کرنے اور اس کی واہ واہی بٹورنے کے لیے لکھتا ہے۔ اور وہ حلقہ بھی اپنے پسندیدہ مصنف کی مدح خوانی میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا، نہ مصنف کو اس سے غرض ہوتی ہے کہ اس کی تحریر کتنی منصفانہ ہے اور کتنی جانبدارانہ اور نہ ہی اس کے قارئین کو اس سے کوئی واسطہ۔ یہ صورت حال دل کو تڑپا دینے والی ہے، خدا ہمیں سمجھ نصیب کرے۔

ایک اچھا قلم کار اپنی تحریر پر کبھی جذبات کو اس حد تک غالب نہیں آنے دیتا۔ وہ جب کسی صورتِ حال کا تجزیہ کرتا ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس سلسلے میں خود اس کی خوشی کس چیز میں ہے۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ صحیح صورتِ حال کو اور اس سے نکلنے والے نتائج کو پوری ایمان داری سے پیش کردے۔ وہ یہ دیکھ کر خوش نہیں ہوتا کہ اسے اپنے مخالفین کو کوسنے کا ایک اور موقع ہاتھ آ گیا؛ بلکہ اس کی خوشی و ناخوشی کا دارومدار اس پر ہوتا ہے کہ اس واقعے کا مثبت و منفی، کیا اثر انسانیت پر پڑنے والا ہے۔ اس کا دل انسانیت کے لیے تڑپتا ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنے مخالفین وموافقین کے دائرے سے اوپر اٹھ کر قلم اٹھاتا ہے۔

جو تحریریں حظِ نفس کے لیے لکھی جاتی ہیں وہ کچھ وقت کے لیے کچھ لوگوں کو خوش تو کردیتی ہیں؛ لیکن ایسی تحریروں کی عمر لمبی نہیں ہوتی اور ایسی تحریریں اپنے مخصوص حلقے سے اوپر اٹھ کر مقبولیت حاصل نہیں کر پاتیں۔ اس لیے ایک اچھے قلم کار کو چاہیے کہ وہ انسانیت کے بھلے کے لیے قلم اٹھائے اور صورتِ حال کا منصفانہ تجزیہ پیش کرے۔ اس کا قلم انسانیت کی خدمت کے لیے چلے، نہ کہ اس کے نفس کی تسکین اور اس کی آتشِ انتقام کے بجھانے کے لیے۔

☆☆☆

تعلیم و تربیت

نوجوان بچوں کا شام کو گھر آنا

تلخیص وترجمانی
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

والدین اور نوجوان کے درمیان عام طور پر شام کو گھر لوٹنے کے وقت کی تعیین کو لے کر بڑی مشکل کھڑی ہوتی ہے، کیونکہ والدین در اصل شام کو دیر تک بچوں بالخصوص بیٹیوں کے باہر رہنے سے پریشان ہوتے ہیں، جبکہ نوجوان دیر تک گھر سے باہر رہنے کو اپنے استقلال وآزادی کی علامت سمجھتا ہے، اور اس سے اس کو اپنے بڑی ہوجانے کا احساس ہوتا ہے، اور وہ خیال کرتا ہے کہ وہ خود ہی اس کا اہل ہے کہ اپنے آنے جانے کے وقت کی تعیین کرے، البتہ وہ اس کو پسند کرے یا نہ کرے مگر حقیقت یہی ہوتی ہے کہ وہ اب بھی نوعمری کے مرحلہ میں ہے، بہت کچھ پختگی آنے کے بعد بھی وہ مکمل طور پر باشعور و پختہ کار نہیں ہوا ہے، اس کو ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے اور زندگی سے بہت کچھ واقفیت حاصل کرنا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ نوعمر بچے جب آپس میں جمع ہوتے ہیں تو ان سے کچھ ایسے امور ظاہر ہوتے ہیں جو عام طور پر تنہا بچے سے ظاہر نہیں ہوتے، ایسا در اصل گروپ کے دباؤ میں ہوتا ہے، کیونکہ گروپ کا ہر ممبر یہ سمجھتا ہے کہ اس کو اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے معیار کے مطابق رہنا چاہیے، اسی لیے وہ کوشش کرتا ہے کہ ان سے الگ نہ ہو، اسی لیے وہ کبھی ایسے کام بھی کرتا ہے جو اس کی عادت وفکر اور مزاج کے لیے عجیب ہوتے ہیں، خاص طور پر اگر اس کے دوست اس کو چیلنج کردیں کہ وہ فلاں کام انجام نہیں دے سکتا تو وہ اس کو کرنے کے لیے اپنا پورا زور صرف کردیتا ہے، اس میں دورائے نہیں کہ کبھی کبھی گروپ کا پریشر ہوتا ہے اور ایسے حالات اس کے لیے بن جاتے ہیں، لیکن اس کے باوجود رات میں دیر سے گھر لوٹنے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اس کی اپنی اہمیت ہے، والدین کے لیے ضروری ہے کہ وہ مؤثر انداز میں اس کے حل وعلاج کی فوری کوشش کریں۔

سب سے پہلی بات یہ آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ آپ اپنے نوجوان بچے کے اندر ہر پیدا ہونے والے خیال سے اس کو محفوظ نہیں رکھ سکتے، جب وہ ۱۸/سال کا ہوجائے گا تو یقینی طور پر وہ کالج و یونیورسٹی جائے گا، یہ بھی ممکن ہے کہ یونیورسٹی میں داخلہ کے لیے وہ کسی اور شہر میں جا کر رہے، اس عمر میں قانونی اعتبار سے وہ پختہ شعور اور اپنے اعمال کے لیے خود ہی ذمہ دار سمجھا جاتا ہے، لیکن اگر نوعمری کے ابتدائی مرحلہ میں آپ نے اپنی ذمہ داری پوری کی جبکہ وہ زندگی کے متعلق یہ تصور کرنے لگتا ہے کہ اس کا موقف پختہ ہے اور وہ اچھی

طرح سے ذمہ داری اٹھانے کا اہل ہے، تو پھر یقینی طور پر ایک مرحلہ وہ آئے گا جبکہ خود ہی صحیح رویہ اپنائے گا اور اچھے برتاؤ کا عادی ہوگا، گھر سے باہر کوئی اس کا نگراں نہیں ہوگا جو ہمیشہ اس کو پابندیوں پر روک ٹوک اور تذکیر کرے، ایسا کوئی نہیں ہوگا جو اس سے کہے کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو، بلکہ وہ خود ہی اپنی ذمہ داری کو سمجھے گا اور مناسب انداز میں اسے پورا کرے گا، اس مرحلہ میں ایک حد تک اس میں مختلف امور پر صحیح حکم لگانے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے، اور اپنے فیصلوں نیز اپنے اقدامات کے نتائج پر غور کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے۔

گویا اب اس کی زندگی میں وہ وقت آ گیا کہ آپ اس پر، اس کے تصرفات پر یقین کرنا شروع کریں، کیونکہ اب عمر کے اس مرحلہ میں اس کو گھر سے باہر جانا ہے، تعلیم یا کام کے لیے، یعنی اب اس کو والدین کے آغوشِ محبت سے دور جانا ہے، یہی اللہ کی بنائی ہوئی زندگی کا اصول ہے۔

اگر اس سے آپ کے تعلقات بہتر اور خوشگوار رہیں گے تو ہمیشہ وہ آپ کی بات سنے گا اور آپ کی نصیحت کی قدر کرے گا اور ہر معاملہ میں آپ کی رائے کا احترام کرے گا، اگرچہ اس کی زندگی سے بتدریج آپ کے اثرات کم ہوں گے، آپ کو بھی کوشش یہی کرنا ہے کہ آپ اس سے ذرا دوری بنائیں اور اس کو آزاد چھوڑیں تاکہ وہ اپنا طریقۂ زندگی خود منتخب کرے، دوسری بات یہ ہے کہ صرف رات کو گھر آنے کے وقت کی تعیین اہم نہیں ہے، بلکہ یہ بھی جاننا اہم ہے کہ اس دوران وہ کہاں رہتا ہے کن لوگوں کے ساتھ رہتا ہے، آپ ہمیشہ یہ جاننے کی ضرور کوشش کیجئے کہ وہ کہاں جارہا ہے؟ کس کے ساتھ جارہا ہے؟ یہ بہت اہم امور ہیں جن کا جاننا ضروری ہے، اگر آپ اس کی ابتدائی زندگی میں خود اپنے متعلق صراحت کرتے رہے ہوں گے تو یقینی طور پر وہ اس طرح پروان چڑھے گا کہ اپنے خاص معاملات میں آپ کو باخبر رکھنے سے نہیں ہچکچائے گا، لیکن آپ کو اس کے آنے جانے کے وقت سوال جواب نہیں کرنا ہے، بلکہ وہ خود ہی آپ کو بتائے گا کہ وہ کہاں جارہا ہے اور کس سے ملنے جارہا ہے، اس لیے آپ کو اس سے اس طرح کے جملے استعمال کرنا چاہیے مثلاً آپ اس سے یہ کہنے کے بجائے ''تم کہاں جارہے ہو؟'' یہ کہیے ''کیا تم کہیں ایسی جگہ جارہے ہو جو پُر لطف اور قابل دید ہے؟'' اس سے یہ پوچھنے کے بجائے کہ ''تم نے کیا کیا؟'' یہ پوچھیے ''کیا تمہارا وقت اچھا گذرا''، یہ سوال کرنے کے بجائے کہ ''تمہارے ساتھ کون جارہا ہے''؟ یہ کہیے ''کیا تمہارا دوست عمر بھی تمہارے ساتھ جارہا ہے؟''، یہ کہنے کے بجائے کہ ''تم وہاں جاکر کیا کروگے؟'' آپ یہ کہہ سکتے ہیں ''کیا تم وہاں جاکر فٹبال کھیلوگے''؟۔

چنانچہ ایسے سوالات کا وہ آپ کو کبھی مفید جواب نہیں دے گا جن سے اس کو یہ محسوس ہو کہ آپ اس پر شک کررہے ہیں یا اس کے جانے پر اس کو ملامت کررہے ہیں، بلکہ وہ یا تو خاموشی اختیار کرے گا یا پھر چھپائے گا، اس کے برخلاف سرسری اور فطری سوالات سے انسان پُر امید ہوتا ہے اور پھر وہ اپنی معلومات دوسروں سے شیئر کرتا ہے، ان سب چیزوں کے باوجود اگر آپ کو یہ توقع ہے کہ نوجوان بچہ اپنی زندگی کے تمام معاملات سے آپ کو واقف کرائے تو یہ غیر واقعی اور غیر معقول بات ہے، اس کو ہر حال میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے کچھ خاص راز ہوں، ان رازوں سے ہی اس کو اپنی آزادی اور اپنے استقلال کا احساس ہوتا ہے، چنانچہ بسا اوقات وہ کسی چیز کو جانتا ہے لیکن بڑے نہیں جانتے، وہ اس کو اپنی زندگی کے لیے محفوظ رکھتا ہے، آپ کبھی بھی اس سے اس کے راز جاننے کی کوشش کریں گے تو نہ صرف یہ کہ وہ بتائے گا نہیں بلکہ پھر وہ گفتگو کرنا کم کردے گا، اس لیے اس مسئلہ میں بھی آپ فطری طریقہ استعمال کیجئے، آپ اس پر بھروسہ کیجئے تو وہ آپ پر بھروسہ کرے گا اور آپ سے گفتگو کرے گا، اس بات کو مزید اس حدیث سے سمجھا جاسکتا ہے جو کہ صحیحین میں حضرت

انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ۱۰ر سال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی مگر میرے کیے ہوئے کسی کام پر آنحضرتؐ نے یہ نہیں پوچھا کہ تم نے یہ کیوں کیا؟ اور نہ ہی میرے کسی چیز کو چھوڑنے پر آنحضرتؐ نے یہ پوچھا کہ تم نے اس کو کیوں چھوڑ دیا؟

جب آپ یہ جان لیں کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور کس کے ساتھ جا رہا ہے، تو اب تیسری بات یہ ہے کہ آپ اس کے ساتھ واپسی کا وقت طے کیجئے، اور یہ دھیان رکھیے کہ عمر کے اس مرحلہ میں اس پر اپنی طرف سے تھوپنے کے بجائے اس سے مشورہ کر کے وقت طے کرنا زیادہ بہتر ہوگا، چنانچہ آپ اس سے اس طرح پوچھ سکتے ہیں ''تمہاری واپسی کے لیے معقول و مناسب وقت کیا ہوگا''، اس کا جواب مل جانے کے بعد اس کے ساتھ مل کر مناسب حل تک پہنچنے کی کوشش کیجئے جس سے آپ بھی راضی ہوں اور وہ بھی خوش ہو، جب آپ دونوں کسی وقت کے تعین پر متفق ہو جائیں تو پھر اس کے سامنے اچھی طرح یہ واضح کیجئے کہ آپ اس پر کس قدر اعتماد کرتے ہیں اور اس سے عہد کی پابندی کی کس قدر توقع رکھتے ہیں، اب اگر اس پورے مرحلہ اور گفت و شنید کے بعد پھر بھی وہ رات میں دیر سے لوٹے، تو پہلے اس کو بات کرنے کی اجازت دیجئے اور اس کی توجیہات و اسباب سنیے، ممکن ہے کہ اس کے بیان کردہ اسباب درست اور قائل کرنے والے ہوں، لیکن پھر بھی آپ کوشش کیجئے کہ آپ ایک مضبوط و معقول موقف کا اظہار کریں، اور اس کو بتائیں کہ آپ اس سے اس کی توقع کرتے ہیں کہ وہ اچھی طرح اوقات کی ترتیب کا اہتمام کرے تاکہ طے شدہ وقت کی لازمی طور پر پابندی کر سکے، پھر یہ کہ اگر اس کی تاخیر کے اسباب صحیح اور معقول ہوں تو اس کو بتائیے کہ مانا کہ تم لیٹ ہو گئے تھے مگر تم کسی کے فون سے اطلاع بھی تو کر سکتے تھے، تمہارا فون آ جاتا تو ہم پرسکون رہتے اور تمہارے آنے کا انتظار کرتے۔

یہاں آپ اس کے سامنے یہ گفتگو بھی کر سکتے ہیں کہ ماں باپ اپنے بچوں کو لے کر کس طرح پریشان ہوتے ہیں اور کس کس طرح کے خطرات سے خائف رہتے ہیں، جبکہ نوجوان بچوں کو اس کا ادراک تک نہیں ہوتا، بلکہ وہ اس طرح کے خوف و پریشانی کو صحیح ہی نہیں سمجھتا اور والدین کے لیے یہی خوف ایک معنی خیز حقیقت ہوتا ہے، اس کو بتائیے کہ نوجوان بچوں کو اس کا احساس تب ہوتا ہے جب وہ بڑے ہو جاتے ہیں، صاحبِ اولاد ہوتے ہیں اور ان کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں لیکن جب تک وہ اس مرحلہ تک نہ پہنچیں انھیں اپنے والد کے جذبات کا احترام کرنا چاہیے، اس طرح کی وضاحتی گفتگو کے بعد آپ کے بچے میں یہ شعور پیدا ہو جائے گا کہ اگر وہ واقعی وقت پر نہیں پہنچ سکتا ہے تو اس کو فون سے اطلاع دے دینا چاہیے، اب اس کے اندر یہ بات آپ کے جذبات کے احترام میں خود ہی پیدا ہوگی نہ کہ وہ محض اس کو ذمہ داری سمجھ کر کرے گا۔

بچے کے ساتھ تعامل میں اگر یہ طریقہ آپ استعمال کریں گے تو غالب گمان یہ ہے کہ وقت کی ترتیب و پابندی کی مشکل سے آپ بچ سکیں گے، لیکن پھر بھی اگر یہ مشکل باقی رہے اور وہ وقت کی پابندی نہ کرے تو پھر آپ کو ذرا ڈٹنا پڑے گا اور یہ آپ کا حق ہوگا، کیونکہ آپ پر اس کی تربیت کی ذمہ داری ہے، آپ نے یقیناً اس کو موقع دیا کہ وہ یہ ذمہ داری خود اٹھائے مگر نتیجہ یہ معلوم ہوا کہ ابھی وہ یہ ذمہ داری اٹھانے کے معیار پر نہیں پہنچا، اب مثلاً اس نے بار بار لوٹنے میں تاخیر کی تو اس سے کہہ دیا جائے کہ اب وہ ایک ہفتہ تک شام کو گھر سے باہر نہیں نکلے گا، یہ اس کے وقت مقرر پر گھر نہ لوٹنے کا لازمی نتیجہ ہے، وہ اگر یہ چاہتا ہے کہ بڑوں کی طرح ذمہ داری اٹھائے تو پھر اس کو یہ ثابت بھی کرنا ہوگا کہ وہ بڑوں کی طرح ذمہ داری اٹھانے کا معیار رکھتا ہے، اس کے باوجود اس موقع پر آپ کو یہ غلطی نہیں کرنا ہے کہ آپ اس کو فوراً اس موضوع پر لمبی چوڑی نصیحت کرنا شروع کر دیں اور ایک لیکچر پلا

دیں، اور اس پر بغیر مشق کے ذمہ داری اٹھانے کو لازمی قرار دے دیں، ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ اس کو سیکھنے کے اور مشق کے مواقع فراہم کریں، یقینی طور پر اگر آپ کا بچہ یہ محسوس کرے گا کہ آپ اس کو امانت دار سمجھتے ہیں اور اس پر اعتماد کرتے ہیں تو وہ پوری محنت سے اس اعتماد و امانت داری کے معیار پر کھرا اترنے کی کوشش کرے گا۔

دوستوں اور ساتھیوں کی اھمیت:

نوجوانی کے مرحلہ میں دوستی ایک اہم اور حساس مسئلہ ہے، عام طور پر دوستی کی ابتدا کا زمانہ سیکنڈری لیول (Secondary) کے مرحلہ سے ہوتی ہے، سیکنڈری کے مرحلہ میں آنے سے پہلے تک بچہ عام طور پر اپنے والدین اور اساتذہ کو ہی اپنی زندگی میں آئیڈیل سمجھتا ہے، لیکن اس مرحلہ میں داخل ہوتے ہی وہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگتا ہے، ان کی شخصیت (Personality) اور ان کے سلوک (Behavior) سے متاثر ہونے لگتا ہے، لیکن نوجوانوں کے لیے یہ بھی بہت اہم ہے کہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے سے پہلے (لڑکا ہو یا لڑکی) دوسروں سے الگ اور آزاد ہوں، انھیں خود اپنی انفرادی اور مستقل شخصیت کا احساس ہو، اور یہ ایک فطری خواہش ہے جو عام طور سے نوجوانوں میں ہوتی ہے کہ وہ ایسا کچھ کریں کہ جس سے اپنے معاصرین، اپنے عہد اور اپنی نسل کے مابین ممتاز ہوں، اگر ہم اپنے آپ کو دیکھیں تو ہم خود اپنی نسل اپنے عہد اور اپنے ماحول سے ممتاز نظر آنے کی یہ خواہش اپنے اندر رکھتے تھے، لہٰذا دیگر نسلیں بھی آئندہ اس طرح سوچیں گی اور سوچتی ہیں، اس لیے اگر باہمی احترام کے ساتھ اس مسئلہ میں بھی مفاہمت کا انداز اپنایا جائے گا تو قوی امید ہے کہ مشکلات نہیں پیدا ہوں گی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ نوجوان بچے وہی کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو عام طور پر ان کے دوست احباب کرتے ہیں بلکہ ان کی نظر میں ان کے عمل کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، چنانچہ اگر کسی بچے کے دوست فٹبال کے شوقین ہیں تو وہ بھی فٹبال کھیلنا چاہتا ہے، کسی کے دوست کمپیوٹر گیم (Computer Game) کے دلدادہ ہیں تو وہ طبعی طور پر وہی کھیلنا چاہتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ یہ معاملہ محض کھیل کود اور صورت و شکل تک محدود رہے، بلکہ دوستوں کے اثرات افکار، مواقف، زبان اور اصطلاحات و مفاہیم تک پڑ سکتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ نوجوان بہت آسانی سے متاثر ہو جاتا ہے اور دوسروں کی تابعداری کرنے لگتا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نوجوان کو اس کا شدید احساس ہوتا ہے کہ اس کی نسبت اس گروپ کی طرف ہو جو عمر، خصوصیات اور امتیازات میں اس سے بہت قریب ہے، پھر اس نسبت کے ذریعہ وہ اس گروپ کے درمیان اپنی مستقل شخصیت کو پہچاننے اور نکھارنے کی کوشش کرتا ہے، چنانچہ اگر اس کے ہمجولی اور دوست اس کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ وہ بہت اچھا اور بہت باصلاحیت ہے، تو وہ خود اپنی نظر میں بھی بہت اچھا اور باصلاحیت ہوتا ہے، اور اگر دوستوں کا زاویۂ نظر اس کے برعکس ہوتا ہے تو وہ خود بھی اپنی نظر میں اپنے آپ کو بے کار اور بے صلاحیت سمجھتا ہے۔

عام طور پر بچوں کی دوستی پڑوسی لڑکوں سے ہوتی ہے یا اسکول میں ساتھ پڑھنے والوں سے، یہ امر طبعی ہے کہ ان دوستوں کو بچہ جس زاویہ سے دیکھتا ہے اس کے والدین کا ان کے متعلق زاویہ نگاہ اس سے مختلف ہوتا ہے، چنانچہ جب تک معاملات معقول و مقبول حدود میں رہیں اور دوستی ان حدود سے تجاوز نہ کرے، جو عام طور پر والدین عرفِ عام اور اقدار و روایات کے پیش نظر متعین کرتے ہیں، تب تک بچے کو اس قدر آزادی دینا چاہیے کہ اس کو آزادی کا احساس ہو، البتہ اگر معاملہ حد سے تجاوز ہو تو پھر والدین کو رہنمائی و نصیحت کا حق ہے، یہاں پھر وہی باہمی مذاکرہ مفید ہوگا جس کا ہم اس فصل میں بار بار

تذکرہ کرتے آئے ہیں، کیونکہ برداشت اور باہمی تعاون و احترام ہر حال میں محاذ آرائی، نزاع اور ٹکراؤ سے بہتر ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ نوجوان دوستوں میں اپنی مقبولیت کا حریص ہوتا ہے، اسی لیے وہ ان کے سامنے ایسے لباس اور ایسی شکل میں جانا چاہتا ہے جس میں اس کے دوست اس کی قدر کریں، اس کی اس خواہش کا اثر اس کے پہناوے (لباس کے انتخاب) بال سنوارنے (Hair Style) پر بھی صاف نظر آتا ہے، والدین اس سلسلہ میں جو بھی کہیں مگر وہ دوستوں کے ذوق ونقطۂ نظر کے حساب سے ہی انتخاب کرتا ہے، اسی لیے والدین کو اس معاملہ میں یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ نوجوانوں کو آزاد چھوڑ دیں تاکہ اپنی خواہش کے مطابق انتخاب کرسکیں، کیونکہ کچھ مدت کے بعد جب وہ پختہ عقل اور پختہ شعور جوان ہوگا تو اسی پر یہ ذمہ داری ہوگی کہ اپنے فیصلے خود لے اور خاص امور میں خود ہی فیصلہ کرے، اس لیے اس کو چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ ابھی سے کچھ فیصلے لے، کچھ ذمہ داریاں اٹھائے اور کچھ اپنے فیصلوں کے نتائج کا سامنا کرے، اس میں کوئی شک نہیں کہ لباس اور آدمی کی ظاہری شکل کا بڑا تعلق انفرادی ذوق ومزاج سے ہے، اور یہ ذوق ایک نسل کا دوسری نسل سے مختلف ہونا یقینی اور ظاہر ہے، چنانچہ ہم میں سے ہر ایک اپنے والدین کی تصویروں میں پرانے طرز کے ملبوسات کو دیکھ سکتا ہے، کیا آج ان ہی ملبوسات کے پہننے کو ہم ترجیح دیتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر یہی مسئلہ ہمارے نوجوان بچے کا ہوگا کہ اس کا ذوق ہمارے ذوق سے مختلف ہوگا اور وہ ہمارے ملبوسات کے پہننے کو ہماری ہی طرح ترجیح نہیں دے گا۔

اس تفصیل کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سلسلہ میں نہ ہی آپ اپنی رائے دیجئے اور نہ ہی اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کیجئے، مطلب یہ ہے کہ آپ اس سلسلہ میں سختی نہ برتیں، متشدد نہ بنیں بلکہ نرمی اختیار کریں، مفاہمت کا طریقہ اختیار کریں تاکہ آپ کا بچہ آپ کی بات توجہ سے سنے اور آپ کی رائے کا احترام کرے۔

کبھی ایسا بھی ہوگا کہ نوجوان بچہ نامناسب اور نامعقول چیز کا انتخاب کرے گا، بالخصوص یہ مسئلہ ''فیشن'' کے اختیار کرنے میں درپیش ہوگا، اس موقع پر آپ کو باصرار بحیثیت والد اپنا کردار ادا کرنا ہوگا اور اس نامناسب اور نامعقول عمل سے روکنا ہوگا، جس پر ایک مدت کے بعد بچہ خود بھی نادم ہوگا، اس کے سامنے وضاحت اور مضبوطی سے اپنی رائے اور اپنا موقف بیان کیجئے، جن چیزوں کو آپ درست سمجھتے ہیں اور جو آپ کے مقاصد ہیں ان کو بیان کیجئے، یاد رکھیے کہ پیشگی تحفظ کا طریقہ ہمیشہ علاج سے بہتر ہوتا ہے، یہ اس طرح ممکن ہے کہ آپ بچے کی عمر کے ابتدائی دس سالوں میں اس کے کپڑے اور ظاہری استعمال کی چیزیں خریدنے کے لیے اس کو ساتھ لے جائیے اور اس کو باقاعدہ خریدنے کے عمل میں شریک کیجئے، بازار جاتے ہوئے اس کو کپڑے خریدنے کے لیے مختص رقم کے بارے میں بتا دیجئے کہ مثلاً 500/ روپیے تک کا کپڑے خریدنا ہے، پھر اس کے مناسب کپڑے خریدنے کے لیے کچھ مذاکرہ کیجئے، اس کو اس کی اجازت دیجئے کہ وہ اپنی پسند اور اپنی ضرورت کے متعلق اس مختص رقم کے تناسب کو دیکھتے ہوئے کھل کر اپنی رائے دے سکے، اگر ابتدائی سالوں میں آپ اس طرح کی کوشش کریں گے تو پھر نوعمری کے مرحلہ میں آپ کے لیے بچے کو لباس کے انتخاب کی ذمہ داری دینا آسان ہوگا، کبھی کبھی اس کو ماہانہ کچھ رقم دیجئے تاکہ وہ اپنی ضروریات کے پیش نظر خرچ کی ترتیب کا اہتمام کرنے کا تجربہ کرے، اس کو خود ہی اپنی ضرورت کے کپڑے سے کچھ پس انداز کرکے یہ قیمتی سامان خریدے، یہ طریقۂ تربیت بچے کے اندر آئندہ زندگی کے لیے خرچ میں نظم و ضبط کی قدرت پیدا کرے گا، اس لیے ضروری ہے کہ اس کی مشق کے لیے اس کو کچھ ذمہ داری اور آزادی فراہم کی جائے،

ممکن ہے کہ وہ اس میں کبھی کبھی خطا بھی کرے گا، البتہ اگر ہمیشہ سارے کام آپ ہی کرتے رہے اور ساری ذمہ داری آپ ہی نبھاتے رہے اور آپ نے اس کو کبھی فیصلہ لینے کا اختیار دیا نہ آزادی اور نہ ذمہ داری تو پھر سوال اور اہم سوال یہ ہے کہ آخر وہ کب سیکھے گا، زندگی کا وہ کون سا مرحلہ ہوگا جس میں وہ ان سب امور سے واقف ہوگا؟؟

جنسی نمو:

عام طور پر بچیاں دوسری دہائی کے نصف اول میں پوری طرح بالغ ہوجاتی ہیں اور ان میں افزائش نسل کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے، جبکہ لڑکوں میں یہ صلاحیت ۱۶/سال کی عمر میں پیدا ہوتی ہے، نوجوانوں میں پیدا ہونے والی ان جسمانی تبدیلیوں کے سبب بڑی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور اس کے سبب بہت سے سوالات ہوتے ہیں، سب سے زیادہ اس کے ذہن میں جنسی عمل سے متعلق سوال گردش کرتا ہے، یہیں سے ہمارے سامنے نوعمروں کو جنسی معلومات فراہم کرنے کی اہمیت واضح ہوتی ہے، صحیح بات یہ ہے کہ اگر بچپن میں آپ نے بچے کے سوالات کے ساتھ اصولی اور حکمت آمیز رویّہ اپنایا، انسانی جسم، اس کے فنکشن (Function) اور خصوصیات کی وضاحت کے لیے بچپن میں آپ نے اصولی موقف اور طریقہ اپنایا تو پھر نوعمری کے اس مرحلہ میں قوی امکان اس کا ہے کہ اس کے سوالات بہت آسان ہوں گے جن کا جواب بھی آسانی سے دیا جاسکے گا، لیکن اگر آپ نے اس سے اس تعلق سے کبھی کوئی گفتگو نہیں کی، جسمانی تبدیلی اور جنسی عمل کے متعلق آپ نے تمام چیزوں کو اس سے مخفی رکھا، تو اب بہتر یہ ہے کہ اس کے ساتھ کچھ وقت گذاریے اور مطلوب وضروری معلومات اس کو فراہم کیجئے، اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ اس کو کوئی ایسی کتاب فراہم کردی جائے جس میں جسمانی نمو اور نوعمری کے مرحلہ میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کی وضاحت کی گئی ہو، آپ ان لوگوں کی طرح یہ غلطی قطعی نہ کیجئے جو یہ کہتے ہیں کہ جنسی عمل اور جسمانی تغیرات کے متعلق معلومات فراہم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بچہ خود ہی یہ امور اسکول میں، یا کہیں اور یا اپنے دوستوں سے یہ سب معلومات حاصل کرلے گا۔

یہ صحیح ہے کہ بچہ بہت سی باتیں اسکول اور دوستوں کے ماحول سے سیکھ لیتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس کو جو معلومات حاصل ہوں وہ سب صحیح ہی ہوں، پھر اگر معلومات حاصل ہو بھی جائیں تو ان کو برتنے کے صحیح طریقے اور صحیح موقف کے فقدان کا قوی امکان ہوتا ہے، پھر یہ کہ بچہ دوسروں سے چاہے جس قدر سیکھ لے مگر یہ ضرورت پھر بھی باقی رہتی ہے کہ وہ اس موضوع پر آپ سے سوالات کرے اور آپ سے گفتگو کرے۔

اگر گھر میں اس طرح کا ماحول ہموار ہوتا ہے جس میں انسانی جسم کی کیفیت، اس کا نمو، جسمانی تغیرات اور اعضائے جسمانی کے استعمال کا فہم ممکن ہو، ماحول میں اس قدر گنجائش ہو کہ بچہ ضروری امور کو سمجھ سکے تو پھر اس کے جسم میں جو تغیرات ہوتے ہیں ان سے وہ زیادہ حیران وپریشان نہیں ہوتا، اور پھر وہ جنس مخالف کے جسم کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتا۔

لڑکیوں کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ماہواری آنے سے قبل ہی ان کو اس سے متعلق معلومات فراہم کی جائے، اس کا امکان ہے کہ اچانک خون بہتا دیکھ کر بچی ڈر جائے، بالخصوص اگر اس نے اس طرح کے قصے اپنی سہیلیوں سے سن رکھے ہوں تو اس کے ڈرنے کا زیادہ امکان ہوتا ہے، البتہ اگر اس کو گھر میں صحیح معلومات فراہم کردی گئی ہیں تو پھر اس کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی، اسی طرح بچوں کے لیے سوتے میں احتلام کے متعلق معلومات فراہم کرنا ضروری ہے، بچہ اس کا تو عادی ہوتا ہے کہ صبح کو جب وہ سو کر اٹھتا ہے تو اس کا عضو تناسل سخت اور سیدھا ہوتا ہے، لیکن عنفوان شباب میں وہ بار

بارسخت اور سیدھا ہونے لگتا ہے بلکہ حتی کہ دن میں جاگتے ہوئے یہ صورت پیش آتی ہے جس سے بچہ پریشان ہوتا ہے، بالخصوص تب اس کی پریشانی بڑھ جاتی ہے جبکہ غیر متوقع طور پر اچانک یہ سختی پیدا ہوجاتی ہے اور عضو سیدھا ہوجاتا ہے، پھر جو کچھ اس پر گذرا اس کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے، پھر اگر رات کے تناؤ کے ساتھ بچے کو احتلام بھی ہوجائے تو وہ مزید پریشان ہوتا ہے، اس کی پریشانی میں تب اور اضافہ ہوتا ہے جبکہ اس کو غسل کرنا پڑتا ہے، کپڑے تبدیل کرنے پڑتے ہیں اور بسا اوقات چادر بھی بدلنی پڑتی ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ حیض و احتلام دونوں ہی جسمانی نمو اور تبدیلی کی علامتیں ہیں، اگرچہ بچوں کو اس سے پریشانی ہوتی ہو، اب ایسی صورت میں صحیح اور مفید طریقہ یہ ہے کہ بچوں کو اس مشکل کے برتنے کا طریقہ بتایا جائے اور انھیں حیض و احتلام کی حقیقت سے واقف کرایا جائے، ان کو بتایا جائے کہ یہ دراصل جسمانی صحت کی قوی علامات ہیں، اور اِس کی علامت ہیں کہ دیگر اعضائے جسمانی بھی اپنا کام صحیح طور پر کر رہے ہیں، اور پھر یہ کہ حیض یا احتلام انسان کے قبضۂ قدرت کی چیز نہیں، اور یہ کوئی ایسی چیز بھی نہیں جو معیوب اور باعث شرم ہو۔

عام طور پر جنسی قوت و جذبات نوجوان لڑکے لڑکیوں میں ۱۶ر سے ۱۸ر سال کی عمر تک اپنی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں، البتہ جنسی مسائل و جذبات کو لے کر لڑکیاں ذہنی طور پر زیادہ الجھن کا شکار (Disturb) رہتی ہیں۔

فطری طور پر جنسی عمل و افزائش نسل سے متعلق بچوں سے ایک سنجیدہ اور پرسکون ماحول میں گفتگو کی جاسکتی ہے، ان کو جنسی عمل سے متعلق بات جملے دو جملے میں سمجھائی جاسکتی ہے، باپ بیٹے سے اور ماں بیٹی سے ان مسائل کا مذاکرہ کرسکتی ہے، اس طرح چیزیں صحیح طور پر سمجھنے میں ان کی مدد کی جاسکتی ہے، جنسی عمل (Sex) کے متعلق یہ بتایا جاسکتا ہے کہ یہ دراصل مرد و عورت کے تعلقات کا امتداد ہے، اس تعلق میں لمس و محبت وغیرہ کے جذبات کارفرما ہوتے ہیں، ان مسائل کی معلومات فراہم کرتے وقت اخلاقی اصولوں، دینی اقدار اور اخلاقیات کا کردار بہت اہم ہوجاتا ہے، اس موقع پر اس موضوع سے متعلق آپ اس کے سامنے اپنا اخلاقی نقطۂ نظر واضح کیجئے اور کوشش کیجئے کہ ان اخلاقی اقدار، ان کی حکمت اور ان کے اسباب کو جس نظر سے آپ دیکھ رہے ہیں اور جس طرح آپ سمجھ رہے ہیں اسی نظر سے وہ بھی دیکھے اور سمجھے، اس کو بتایئے کہ ان اخلاقی اقدار کے التزام سے فرد اور معاشرہ اخلاقی انارکی، فحاشی اور جنسی افراتفری سے کس طرح محفوظ رہ سکتا ہے، اس موضوع پر اس سے گفتگو کرتے ہوئے آپ ان قرآنی آیات کی تشریح کیجئے:

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَجَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً، اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ۔ (سورہ روم (۲۱)

''اس کی یہ نشانی ہے کہ اس نے تم ہی میں سے تمہارے لیے جوڑوں (تمہاری بیویوں) کو وجود عطا کیا، تاکہ تمہیں ان سے راحت حاصل ہو، اور تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی رکھ دی، بے شک اس میں غور وفکر کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں''۔

"وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ"۔ (سورہ مومنون ۵)

''اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں''۔

"وفی بضع أحدكم صدقة"

''تم میں سے ہر ایک کے اپنے ملک بضعہ میں تصرف کرنے پر صدقہ ہے''۔

آپ پہلے تو یہ کوشش کیجئے کہ نوعمر بچے جنس

(Sex) کے مسئلہ کو صحیح طریقے سے سمجھ جائیں، اور اخلاقی اصول اور دینی ضابطے سمجھ لیں، پھر دوسرے مرحلہ میں صحیح موقف اور صحیح تعامل سمجھائیے، پھر تیسرے نمبر پر اس کو ضبط نفس یعنی نفس پر قابو پانے اور زندگی کو منظّم بنانے کے فوائد و فضائل بتائیے اور ان کو ہر اس چیز سے واقف کرائیے جو انسانی ترقی کے لحاظ سے اس عمل کے لیے مناسب ہو۔

جو نوجوان پہلے سے ان امور کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں ہوتا وہ زندگی میں پہلی بار کے جنسی ہیجان کے بعد نفس پر قابو پانے میں بہت پریشان ہوتا ہے، چنانچہ اس موضوع پر بچے کی صحیح مدد کے لیے حسن تربیت، تعلیم اور صحیح رہنمائی سے بہتر کچھ بھی نہیں۔

خفیہ عادت یعنی جلق (Masturbation) (یعنی لڑکوں کا ہاتھ کے ذریعہ لذت حاصل کرنا):

بعض اندازوں سے پتہ چلتا ہے کہ بہت سے بچے اور بچیاں نوعمری کے مرحلہ میں ''خفیہ عادت'' کا کسی نہ کسی وقت تجربہ کرتے ہیں، نوجوان لڑکے عام طور پر اپنی شدید ہیجانی جنسی خواہش سے نجات پانے کے لیے اس طرح کی خفیہ عادت (استمنا بالید یعنی جلق) کا استعمال کرتے ہیں، کیونکہ شادی کے ذریعہ فطری طور پر جنسی خواہش کے پورا کرنے میں تاخیر ہوتی ہے، جو کہ عام طور پر معاشرے اور عرف میں شدید خواہش کے باوجود کئی کئی سال مؤخر ہو ہی جاتی ہے، اس صورت حال میں جبکہ جذبات کی برانگیختگی کا سامان بھی ہو اور خواہش بھی شدید ہو مزید یہ کہ صحت و اخلاق پر بظاہر اس عادت کے اثرات بھی نہ ظاہر ہو رہے ہوں، تو پوشیدہ راز کے طور پر اس عادت کے باقی رہنے کا قوی امکان ہے، یہ عادت نہ صرف باقی رہتی ہے بلکہ نوجوانوں کے لیے فراغت کا بہت آسان طریقہ بن جاتی ہے، اس عمل کو روکنے میں صرف وعظ و نصیحت سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا بلکہ اس سے محض نوجوان کو مزید احساس گناہ ہوتا ہے اور ضمیر ملامت کرتا ہے، یہ احساس گناہ شادی کے بعد جنسی عمل کرتے ہوئے بھی کئی سال تک باقی رہتا ہے۔

یہاں والدین کے لیے یہ ہدایت ہے کہ وہ اس پوشیدہ عادت کو نوجوان کا ایک خاص معاملہ سمجھیں، کیونکہ عام طور پر وہ اس عمل کو تنہائی میں خفیہ طریقہ سے ہی انجام دیتا ہے، خدانخواستہ اگر کبھی ایسا ہو کہ آپ اس کے پاس جائیں اور اس کو کسی ایسی حالت میں پائیں جس سے پتہ چلے کہ وہ اس عمل میں مشغول ہیں، تو آپ اس کو بالکل نہ چھیڑیں، بلکہ تجاہل برتیں، قطعی اس طرح اظہار نہ کریں کہ گویا آپ بدحواس ہو گئے اور آپ کو بڑا صدمہ پہنچا، اس موقع پر اگر آپ نے اس کو چھیڑا اور ڈسٹرب کیا تو طویل مدت تک اس پر نفسیاتی اثر ہوگا اور اگر وہ زیادہ حسّاس ہوا تو یہ اثر اور زیادہ ہوگا، بہتر یہ ہوگا کہ ایسے موقع پر آپ معذرت کریں اور وہ جگہ چھوڑ کر فوراً نارمل انداز میں نکل جائیں، بس اس کے لیے آپ کے آنے سے ہی اس پر جو اثر پڑا اور خلل واقع ہوا وہی کافی ہے، کوشش یہ کیجئے کہ جو کچھ ہوا اس کو آپ نہ چھیڑیں اور اس پر کوئی بات نہ ہو، ہاں اگر وہ اس سلسلہ میں آپ سے بات کرے تو پھر اس طرح اس کی مدد کیجئے کہ اچھی طرح اس کی بات سنیے، سمجھیے اور اس پر نہ ہی الزامات عائد کیجئے اور نہ تنقید کیجئے، اس سلسلہ میں شرعی حکم سے واقف کرانے کے لیے کسی فقہی کتاب کی مراجعت بہرحال مفید ہوگی، نظریاتی اعتبار سے انتہائی معتدل نقطۂ نظر کی حامل اور انسانی زندگی کی حقیقتوں کو سمجھانے والی کتاب علامہ قرضاوی کی تصنیف کردہ "الحلال والحرام فی الاسلام" ہے، جو بڑی مقبول و معروف اور مفید کتاب ہے، اس کا اردو ترجمہ میں بھی عرصہ قبل شائع ہو چکا ہے۔

☆☆☆

❑ نقد و نظر

امام ابوحنیفہؒ- چند الزامات اور ان کی حقیقت

تحریر: ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم تلخیص وترجمانی: محمد فرید حبیب ندوی

امام ابوحنیفہ قلیل البضاعہ فی الحدیث تھے:

خطیب بغدادی نے بہت سے اقوال نقل کیے ہیں کہ امام صاحب قلیل البضاعہ فی الحدیث تھے، جیسے عبد اللہ بن مبارک کا یہ قول کہ ابو حنیفہ حدیث کے معاملے میں تو یتیم ہیں۔ ابن قطن کا یہ قول کہ ''ابو حنیفہؒ حدیث میں تہی دست تھے''۔ یحیی بن قطان نے کہا کہ آپ حدیث والے نہیں تھے۔ ابن معین کا یہ قول کہ ابو حنیفہ کے پاس احادیث ہیں ہی کہاں جو تم ان سے کچھ پوچھو۔ احمد بن حنبل کا یہ قول کہ امام ابو حنیفہ کی نہ کوئی رائے ہوتی ہے اور نہ ان کے پاس کوئی حدیث۔ ابو بکر بن داؤد کا یہ قول کہ ابو حنیفہ سے صرف ڈیڑھ سو حدیثیں روایت کی گئیں جن میں سے نصف میں انھوں نے غلطی کی۔ ابن موسیٰ کا قول کہ ابو حنیفہؒ نے پچاس حدیثیں روایت کیں اور ان میں بھی غلطی کی۔

ان اقوال کی اسنادی حیثیت پر تو ہم بحث نہیں کرنا چاہتے کہ محققین نے ان کی حقیقت واضح کر دی ہے؛ لیکن اس طرز فکر کے بارے میں گفتگو کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو امام ابوحنیفہؒ کے معاندین؛ بلکہ معاندینِ حدیث برابر پیش کرتے رہے ہیں اور ابن خلدون نے بھی صیغۂ تمریض سے یہ نقل کر دیا ہے کہ ابوحنیفہؒ کو بس ۱۷ روایات یاد تھیں۔

یہ بڑی اہم بات ہے کہ ایک ایسا امام جس کی فقہ سب سے زیادہ پھیلی اور جس کے مقلدین کروڑوں کی تعداد میں ہیں، اس کے پاس صرف ڈیڑھ سو یا اس سے بھی کم سولہ سترہ حدیثیں تھیں، کیا عقل اسے قبول کر سکتی ہے؟

اس سلسلے میں یہ چند باتیں عرض ہیں:

۱۔ موافقین ومخالفین سب کے نزدیک ابوحنیفہ امام ومجتہد ہیں۔ اور اجتہاد کی شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ احکام کی حدیثیں جو کہ ہزاروں ہیں، مجتہد کے احاطۂ علم میں ہوں اور حنابلہ کے بقول: کم از کم کئی سو حدیثیں اس کے پاس ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ ابوحنیفہ اجتہاد کیسے کر سکتے ہیں اور کیسے ان کے اجتہاد کو ائمہ قبول کر سکتے ہیں اگر یہی شرط آپ کے اندر موجود نہ ہو؟

۲۔ امام ابو حنیفہ کے اجتہادات سیکڑوں مسائل میں صحیح احادیث کے موافق ہیں۔ مرتضی زبیدی نے ایک کتاب ''عقد الجواهر المنيفة فی أدلة أبي حنيفة'' کے نام سے لکھی ہے، جس میں ایسی حدیثیں امام صاحب کی مسانید سے روایت کی ہیں جن میں آپ اور مؤلفین کتب ستہ متفق ہیں۔ سوچنے کی

بات یہ ہے کہ اگر امام صاحب کو صرف چند حدیثیں یاد ہوتیں تو آپ کا اجتہاد سیکڑوں صحیح احادیث کے مطابق کیسے ہوجاتا؟

۳۔ ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں ایک خاص باب اس سلسلے میں قائم کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے صحیح احادیث کی مخالفت کی۔ انھوں نے ۱۲۵ مسائل شمار کرائے ہیں جن میں امام صاحب نے صحیح حدیث کی مخالفت کی۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ابن ابی شیبہ نے ابوحنیفہ کے تمام مسائل جمع کیے ہوں گے تو پھر سوچیے کہ ان ۱۲۵/مسائل کے علاوہ کتنے مسائل ہوں گے جن میں امام صاحب نے صحیح حدیث کی موافقت کی، جب کہ اقل تعداد کے مطابق آپ کے مستنبطہ مسائل ۸۳ ہزار اور ایک روایت کے مطابق ۲/لاکھ کے قریب ہیں۔

۴۔ حدیث کی مصطلحات کے بارے میں امام ابوحنیفہ کی آرا ذکر کی جاتی ہیں، اور فن حدیث کے معتبر علما کے نزدیک وہ معتبر ہیں۔ اگر امام ابوحنیفہ کو صرف چند ہی حدیثیں یاد ہوتیں تو ان کی رائے کو محدثین کیوں اہمیت دیتے؟

۵۔ امام ابو حنیفہ نے چار ہزار شیوخ سے احادیث لکھی تھیں۔ ذہبی نے ان کو شمار بھی کرایا ہے۔ یحیی بن نصر سے روایت ہے کہ میں امام ابوحنیفہ کے کمرے میں داخل ہوا جو کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ فرمایا: احادیث ہیں اور میں نے ان میں سے بہت کم ہی بیان کی ہیں''۔

۶۔ امام ابوحنیفہ اگر چہ محدثین کی عام عادت کے مطابق تحدیث کے لیے نہیں بیٹھے اور نہ ہی آپ نے امام مالک کی طرح احادیث وآثار میں کوئی کتاب لکھی، مگر آپ کے تلامذہ نے آپ کی حدیثیں الگ کتابوں اور مسانید میں جمع کی ہیں۔ ان مسانید کی تعداد دس سے بھی اوپر ہے۔ ان میں سب سے مشہور امام ابو یوسف کی ''کتاب الآثار'' اور امام محمد کی ''کتاب الآثار المرفوعۃ'' اور ''الآثار المرفوعۃ والموقوفۃ'' ہیں۔ ان کے علاوہ مسند الحسن بن زیاد اللؤلؤی اور مسند حماد بن الإمام ابی حنیفہ ہیں۔ اسی طرح آپ کی مسانید میں وہبی، حارثی، بخاری، ابن المظفر، محمد بن جعفر عدل، ابونعیم اصفہانی، قاضی ابوبکر محمد بن عبد الباقی انصاری، ابن ابی العوام اور ابن خسرو بلخی وغیرہ نے کتابیں تصنیف کی ہیں۔

ان میں سے اکثر مسانید کو محمد بن محمد خوارزمی (۶۶۵ھ) نے ''جامع المسانید'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب میں جمع کردیا ہے۔ اس کتاب کو فقہی ترتیب پر مرتب کیا ہے اور مکرر احادیث اور سندوں کو حذف کردیا ہے۔ اس کتاب کے خطبے میں وہ لکھتے ہیں:

''میں نے شام میں بعض جہلا کو امام ابوحنیفہ کی تنقیص کرتے اور آپ پر حدیث میں بے مائیگی کا الزام لگاتے سنا۔ وہ لوگ اس پر دلیلیں یہ پیش کررہے تھے کہ ''امام شافعی کی بھی مسند ہے اور امام مالک کی بھی مؤطا ہے؛ لیکن ابوحنیفہ کی کوئی مسند نہیں''۔ یہ سن کر حمیت دینی نے مجھے آمادہ کیا اور میں نے ان تمام پندرہ مسانید کو جو کبار علما نے امام صاحب کی جمع کررکھی تھیں، اس ایک کتاب میں جمع کردیا''۔ یہ کتاب آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔

مصری محدث محمد بن یوسف صالحانی اپنی کتاب ''عقود الجمان'' میں لکھتے ہیں:

''ابوحنیفہ کبار حفاظ حدیث میں تھے۔ اگر حدیث پر آپ کی نظر وسیع نہ ہوتی تو مسائل فقہ میں استنباط آپ کے لیے ممکن نہ ہوتا۔ ذہبی نے آپ کو ''طبقات الحفاظ'' میں ذکر کیا ہے، اور آپ کا ذکر اچھے انداز میں کیا ہے''۔

عقود الجمان کے تیئسویں باب میں کہتے ہیں: ''آپ کو احادیث خوب یاد تھیں، مگر آپ سے روایات اس لیے کم ہیں کہ آپ استنباط میں مشغول تھے۔ اسی سبب سے امام مالک اور امام شافعی سے بھی زیادہ روایات منقول نہیں ہیں، جیسے صحابۂ کرام میں حضرت صدیق اور حضرت عمر سے ان صحابہ کے مقابلے میں جو آپ سے کم مرتبہ تھے بہت کم روایات منقول ہیں، باجود یہ کہ

دونوں حضرات احادیث سے خوب واقف تھے''۔

ابن طولون صاحب ''الفہرست الاوسط'' اور صالحانی نے امام صاحب کی سترہ مسانید کا تذکرہ کیا ہے۔ان کے علاوہ تین مسانید اور بھی ہیں: دارقطنی کی مسند ابوحنیفہ، ابن شاہین کی مسند اور خطیب بغدادی کی مسند ابوحنیفہؒ۔

علامہ عینی نے تاریخ کبیر میں لکھا ہے کہ ابن عقدہ کی مسند ابوحنیفہ ایک ہزار سے زائد حدیثوں پر مشتمل ہے۔یہ مسند بھی اوپر ذکر کی گئی مسانید کے علاوہ ہے۔سیوطی نے ''تعقیبات'' میں ابن عقدہ کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ تمام لوگوں نے آپ کو ثقہ بتایا ہے، صرف ان لوگوں نے ضعیف کہا ہے جو متعصب تھے۔

اوپر ذکر کردہ تفصیلات سے امام صاحب کے حدیث میں کم مایہ ہونے کا جو دعوی کیا گیا تھا، اس کی غلطی واضح ہوگئی۔اب رہی یہ بات کہ آپ کو صرف سترہ کے قریب حدیثیں یاد تھیں، تو اس کو سوائے ابن خلدون کے کسی اور معتبر شخص نے ذکر نہیں کیا ہے۔اور خود ابن خلدون نے بھی مبہم عبارت سے اسے بیان کیا ہے۔اس بات کی غلطی اس سے واضح ہوجاتی ہے کہ جن مسانید کا اوپر ذکر کیا گیا، ان میں امام صاحب کی صحیح احادیث اور فقہ میں آپ سے منقول صحیح احادیث خود سیکڑوں سے متجاوز ہیں۔

یہاں ایک غلطی پر تنبیہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جو بہت سے اصحاب قلم کو ہوگئی ہے کہ وہ امام صاحب کی قلتِ حدیث کا دفاع کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ امام صاحب کوفے میں تھے اور وہاں احادیث کم تھیں، اور کوفہ دارالحدیث نہیں تھا۔اس غلطی کا شکار یہ لوگ اس وجہ سے ہوئے کہ امام صاحب کے زمانے میں کوفہ کی علمی حیثیت اور امام صاحب کے دوسرے اسلامی شہروں کے اسفار کی حقیقت ان کی نگاہوں سے اوجھل رہی۔

کوفے کی جہاں تک بات ہے تو یہ شہر اپنی تعمیر کے وقت سے ہی کبار صحابہ کی آماجگاہ رہا ہے۔حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو قرآن وفقہ کی تعلیم دینے کے لیے کوفہ روانہ کیا تھا اور کہا تھا کہ اے اہل کوفہ! ''میں نے عبداللہ بن مسعود کے سلسلے میں خود اپنے اوپر تم کو ترجیح دی ہے''۔یہ ابن مسعود کی قدر ومنزلت ہی ہے کہ خود خلیفۃ المسلمین بھی ان سے بے نیازی نہیں ظاہر کر پا رہے ہیں۔

حضرت ابن مسعود جیسے جلیل القدر اور وسیع العلم صحابی نے خلافت عثمانی کے اواخر تک کوفہ کو سیراب کیا اور بہت سے ماہرین فقہ وقراءت تیار کیے۔اسی وجہ سے آپ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ تم نے تو اس بستی کو علم وفقہ سے بھر دیا ہے۔آپ کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ کی تعداد چار ہزار کے قریب ہے جنھوں نے اس شہر کو فیض یاب ومنور کیا۔

حضرت علی اور قرائے صحابہ کے کوفہ منتقل ہوجانے کے بعد تو یہ شہر تمام اسلامی شہروں پر فوقیت لے گیا۔فقہا ومحدثین اور خادمانِ علومِ قرآن اور وابستگانِ عربی زبان کی کثرت میں سب سے برتری لے گیا۔عرب کے فصیح قبائل نے اس کے گرد بسیرا کرلیا۔حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت علیؓ کے شاگردوں کے تراجم اگر ایک جگہ جمع کیے جائیں تو ایک ضخیم جلد درکار ہے۔عجلی نے ان صحابہ کی تعداد جنھوں نے کوفہ کو مسکن بنالیا تھا، پندرہ سو بتائی ہے۔عراق کے دوسرے شہروں میں مقیم صحابۂ کرام اس سے الگ ہیں۔

عظیم تابعی مسروق بن اجدع کا قول ہے کہ: ''میں نے حضور پاک علیہ السلام کے صحابہ کا علم چھ لوگوں میں سمٹا ہوا پایا۔وہ چھ یہ ہیں: حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت عمرؓ، حضرت زیدؓ، حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ، پھر ان چھ حضرات کا علم حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ میں سمٹ آیا تھا''۔

امام ابوحنیفہ کے اسفار پر نظر ڈالیے تو پتہ چلتا ہے کہ آپ نے دس دس مرتبہ تو بصرہ اور مدینہ کا سفر کیا، ۱۳۰ھ سے ۱۳۶ھ تک چھ سال مکے میں قیام کیا۔ان دونوں مبارک شہروں کے

اکثر علما سے اور دوسرے شہروں کے بعض مشاہیر علما جیسے اوزاعی وغیرہ سے ملاقات کی۔ اور مکہ و مدینہ میں حضرت ابن عباس کے تلامذہ سے اکتساب کیا۔ مدینے میں حضرت عمر کے تلامذہ سے اخذ کیا۔ اس طرح حضرت ابن عباس اور حضرت عمر کے علم کو اپنے سینے میں جمع کرلیا۔ اسی طرح آپ نے بعض ائمہ اہل بیت میں سے زین العابدین، محمد الباقر اور ابو محمد بن عبداللہ بن الحسن سے بھی کسب فیض کیا۔

تو امام ابوحنیفہ جیسے امام کی طرف سے جس نے اپنے سینے کو مشاہیر صحابہ کے علم کا گنجینہ بنالیا ہو، یہ کہہ کر دفاع کرنا کہ آپ تو ایسے شہر میں مقیم تھے جہاں حدیثیں کم تھیں، درست نہیں۔ اور پھر کوفہ کی جو شان تھی اس کے مدنظر یہ بات درست بھی نہیں؛ اس لیے کہ دو عظیم صحابہ ابن مسعود اور علی رضی اللہ عنہما وہیں سکونت پذیر تھے۔

امام ابوحنیفہ حدیث پر رائے کو ترجیح دیتے تھے:

یہ الزام بھی غلط ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ امام صاحب حدیث صحیح کے مقابلے میں رائے، قیاس اور استحسان میں سے کسی کو بھی ملحوظ خاطر نہ رکھتے تھے۔ ابن ابی العوام نے اپنی سند سے امام ابو یوسف کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''امام ابوحنیفہ کے سامنے جب کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو پوچھتے کہ کیا تمھارے پاس اس سلسلے میں کوئی اثر مروی ہے، پھر جب ہم پیش کرتے اور خود آپ بھی پیش کرتے تو جس قول کے بارے میں زیادہ آثار مروی ہوتے، اسی کے مطابق فیصلہ فرماتے۔ اور اگر دونوں قولوں کے بارے میں برابر آثار ہوتے تو غور کر کے کسی ایک کو اختیار فرماتے۔

موفق خوارزمی نے ''العالم والمتعلم'' میں اپنی سند کے ساتھ ابو مقاتل حفص بن مسلم سمرقندی سے نقل کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: ''ہر وہ بات جو حضور پاک علیہ السلام نے ارشاد فرمائی خواہ ہم نے سنی ہو یا نہ سنی ہو، ہمارے سر آنکھوں پر ہے، ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں اور گواہی دیتے ہیں کہ جو کچھ آپ نے فرمایا، وہی حق ہے''۔

ابن عبدالبر نے ''الانتقاء'' میں امام صاحب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالی اس پر لعنت بھیجے جو حضور پاک علیہ السلام کی مخالفت کرے۔ آپ کے طفیل تو ہمیں یہ عزت ملی اور ہلاکت سے نجات نصیب ہوئی۔

بیہقی نے المدخل میں عبداللہ بن مبارک کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ میں نے ابوحنیفہ کو کہتے ہوئے سنا: ''حضور پاک علیہ السلام سے منقول ہر بات سر آنکھوں پر ہے، اور صحابہ کرام میں جس کے قول کو چاہیں گے ہم اختیار کریں گے۔ اور اگر کوئی بات تابعین سے مروی ہوگی تو ہم بھی ان ہی کی طرح رائے اور اجتہاد سے کام لیں گے اور ان سے مزاحمت کریں گے''۔

شعرانی نے ''المیزان'' میں امام ابوحنیفہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ کی قسم جس نے کہا کہ ہم نص پر قیاس کو ترجیح دیتے ہیں، اس نے جھوٹ کہا اور افترا سے کام لیا۔ کیا نص کے ہوتے ہوئے بھی قیاس کی ضرورت ہے؟ اور یہ کہ ''ہم قیاس بہت ہی شدید ضرورت کے موقع پر کرتے ہیں۔ مسئلے کی دلیل ہم پہلے کتاب اللہ سے لیتے ہیں، پھر حدیث سے، پھر صحابۂ کرام کے فتاوی سے۔ اور جس پر صحابہ کا اتفاق ہوتا ہے ہم اس پر عمل کرتے ہیں اور جس میں ان کا اختلاف ہوتا ہے تو دونوں مختلف فیہ مسئلوں کے درمیان علت کو سامنے رکھ کر ایک حکم کو دوسرے حکم پر قیاس کرتے ہیں یہاں تک کہ معنی واضح ہوجائیں''۔

امام محمد نے ''المبسوط'' میں خبر آحاد پر عمل کرنے کے سلسلے میں ایک فصل قائم کی ہے اور اس پر آپ ﷺ کے واقعات اور صحابہ کے عمل سے استدلال کیا ہے۔ امام شافعی نے بھی اسے الرسالہ میں بیان کیا ہے۔

یہ تو ان میں سے چند عبارتیں تھیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ صحیح حدیث پر کسی بھی رائے کو ترجیح نہ دیتے تھے

؛ بلکہ ابن حزم نے تو فقہائے عراق سے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ حدیث ضعیف کو قیاس پر ترجیح دی جائے گی۔

ابن قیم نے ''اعلام الموقعین'' میں لکھا ہے ''اصحاب ابوحنیفہ سب متفق ہیں کہ امام صاحب کا مسلک یہ ہے کہ ضعیف حدیث قیاس اور رائے سے بہتر ہے۔اسی نظریے پر امام صاحب نے اپنے مسلک کی بنیاد رکھی ہے، چنانچہ قہقہہ کی ضعیف حدیث کو، سفر میں نبیذ تمر سے وضو کرنے کی اجازت بیان کرنے والی ضعیف حدیث کو قیاس اور رائے پر ترجیح دی۔دس درہم سے کم چوری کرنے والے پر حد سرقہ جاری نہیں ہونے کا حکم بتایا، جب کہ اس کی بنیاد جس حدیث پر ہے وہ بھی ضعیف ہے۔اسی طرح حیض کی اکثر مدت دس دن قرار دی جب کہ اس کے سلسلے میں بھی حدیث ضعیف ہے۔ جمعہ شہر میں پڑھا جائے گا، اس مسئلے کی بنیاد بھی ضعیف حدیث پر ہے۔کنویں کے مسائل میں غیر مرفوع آثار کی وجہ سے قیاس کو چھوڑا۔لہذا امام صاحب کا مسلک یہ ہے کہ ضعیف حدیث اور آثارِ صحابہ کو قیاس پر ترجیح حاصل ہوگی۔یہی مسلک امام احمد کا ہے؛ لیکن سلف اور متأخرین کے یہاں ضعیف کی اصطلاح میں فرق ہے، چنانچہ بسا اوقات متاخرین کے یہاں کوئی حدیث حسن ہوتی ہے؛ لیکن سلف کے نزدیک وہ ضعیف ہوتی ہے'' (کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے)۔

میں کہتا ہوں کہ اسی وجہ سے ہوسکتا ہے کوئی حدیث محدثین کے نزدیک (متقدمین کے اصطلاح کے مطابق ہی سہی) ضعیف ہو؛ لیکن امام صاحب کے نزدیک وہ صحیح ہو۔اور ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک حدیث کسی امام کے نزدیک صحیح ہو جب کہ وہی حدیث دوسرے کے نزدیک ضعیف ہو۔

بہرحال کچھ بھی ہو جب ابن حزم اور ابن قیم جیسے حضرات جو حنفیہ کا سب سے زیادہ رد کرتے ہیں، یہ اعتراف کررہے ہیں کہ امام صاحب کا مسلک ضعیف حدیث کو قیاس پر ترجیح دینے کا ہے تو پھر کسی اور دلیل کی کیا ضرورت ہے؟ ہاں پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ امام ابوحنیفہ ثقہ راویوں کی مراسیل بھی قبول کرتے ہیں، جب کہ امام شافعی انھیں کچھ شرطوں کے ساتھ قبول کرتے ہیں اور محدثین بالکل ہی رد کردیتے ہیں۔مراسیل کے بارے میں امام صاحب کا نقطۂ نظر اس بات کی دلیل ہے کہ آپ قیاس سے اسی وقت کام لیتے ہیں جب کوئی چارۂ کار نہیں بچتا ہے۔

ایک اعتراض: خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں چند راویوں کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ انھوں نے امام ابوحنیفہ کے سامنے چند احادیث پیش کیں؛ لیکن امام صاحب نے انھیں قبول نہیں کیا۔یوسف بن اسباط نے نقل کیا ہے کہ ابو حنیفہ نے حضور پاک علیہ السلام کی چار سو سے زیادہ حدیث رد کر دیں۔(لیکن اس کے باوجود خطیب نے صرف چار ہی روایات پیش کی ہیں)۔وکیع کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ہم نے ابوحنیفہ کو دوسو حدیثوں کی مخالفت کرتے ہوئے دیکھا اور حماد بن مسلم کا قول ہے کہ ابوحنیفہ نے آثار وسنن کو دیکھا اور پھر انھیں رد کیا۔

یہ اقوال اسنادی حیثیت سے صحیح نہ بھی ہوں تب بھی اتنا تو بہرحال ثابت ہوتا ہے کہ بعض محدثین نے آپ پر نقد کیا تھا، اس وجہ سے کہ آپ نے کچھ ایسی حدیثوں کو رد کردیا تھا جو ان محدثین کے نزدیک صحیح تھیں۔اور خود ابن ابی شیبہ کا قول گزر چکا ہے کہ ابوحنیفہ نے ۱۲۵/حدیثوں کی مخالفت کی، حالانکہ خود امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کا قول ہے کہ حضور پاک علیہ السلام کی ہر بات سر آنکھوں پر۔پھر ایسا کیوں؟

جواب:۱- حدیث کی تصحیح وتضعیف میں نقطہائے نظر مختلف ہو سکتے ہیں۔امام ابوحنیفہ کے نزدیک جو راوی ثقہ ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ دوسروں کے نزدیک ضعیف ہو۔امام صاحب اپنے شیوخ کے بارے میں بعد والوں سے زیادہ جاننے والے تھے؛ کیوں کہ آپ کا زمانہ ان سے قدیم ہے۔اکثر وبیشتر آپ کے اور صحابی کے درمیان صرف دو ہی واسطے ہوتے ہیں۔ان دونوں کے بارے میں آپ زیادہ چھان بین کر سکتے ہیں بمقابلہ بعد

والوں کے۔اور جہاں تک ان راویوں کی بات ہے جو حجاز وشام کے تھے اور آپ کے شیوخ نہیں تھے تو زیادہ تر آپ ان کے بارے میں توقف کرتے ہیں اور کبھی ان کے بارے میں آپ کی رائے آپ کے تلامذہ کی رائے سے جدا ہوجاتی ہے، اسی وجہ سے آپ نے بہت سی ایسی حدیثوں پر عمل نہیں کیا جو دوسروں کے نزدیک صحیح تھیں جیسے بہت سے حضرات نے ان حدیثوں کو قبول نہیں کیا جو امام ابوحنیفہ کے نزدیک صحیح تھیں۔

۲۔ بسا اوقات صحیح حدیث میں ہی مجتہد کوئی ایسی چیز دیکھتا ہے جس کی وجہ سے وہ ظاہرِ حدیث کو چھوڑ کر کسی دوسری دلیل کی بنیاد پر کوئی اور رائے قائم کرتا ہے، مثلاً اس میں کوئی خفیہ علت ہو، یا اس مجتہد کے نزدیک کوئی دوسری دلیل اس سے زیادہ قوی ہو، یا وہ یہ سمجھتا ہو کہ اس میں راوی سے وہم ہوا ہے یا وہ اسے منسوخ سمجھے، یا اس کے عام کی تخصیص یا مطلق کی تقیید کر دیتا ہے۔ان تمام اسباب کی وجہ سے وہ اس حدیث پر عمل نہیں کرتا اور محدث اسی کو ترک عمل کا نام دے دیتا ہے۔لیث بن سعد نے ستر حدیثیں شمار کرائی ہیں جو صحیح ہیں اور امام مالک نے ان پر عمل نہیں کیا ہے۔یہ سب حدیثیں مؤطا میں ہیں۔

تقریباً ہر امام کے بارے میں یہ بات ہے کہ اس نے کچھ دوسرے دلائل کی وجہ سے بعض صحیح حدیثوں کو قبول نہیں کیا ہے؛ لیکن اس موقف کو اور اس میں چھپے راز کو ایک نرا محدث نہیں سمجھ سکتا۔محدث اور فقیہ کے درمیان یہی فرق ہے۔

ابن عبد البر نے امام ابو حنیفہ کے شاگرد رشید امام ابو یوسف سے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔اس سے یہ بات بڑی حد تک سمجھ میں آسکتی ہے۔ابو یوسف فرماتے ہیں: ''امام اعمشؒ نے مجھ سے ایک مسئلے کے بارے میں سوال کیا۔اس وقت ہم دونوں کے علاوہ تیسرا کوئی نہ تھا۔میں نے مسئلے کا جواب بتا دیا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا: یہ تم نے کہاں سے لیا؟ میں نے جواب دیا: اسی حدیث سے نکالا جو آپ نے ہم سے بیان کی تھی، پھر میں نے وہ حدیث سنائی۔ وہ کہنے لگے :اے یعقوب! یہ حدیث مجھے تمھاری پیدائش سے بھی پہلے سے یاد ہے، مگر اس کا مطلب ابھی سمجھا ہوں''۔

ابن عبدالبر نے ہی عبداللہ بن عمرو سے نقل کیا ہے کہ ''میں امام اعمش کی مجلس میں تھا۔ایک صاحب آئے جن سے اعمش نے کوئی مسئلہ پوچھا تھا۔وہ جواب نہ دے سکے، پھر ابوحنیفہ نظر آئے تو ان سے پوچھا۔آپ نے جواب دے دیا۔وہ کہنے لگے: کہاں سے یہ جواب آپ نے نکالا؟ آپ نے کہا: اس حدیث سے جو آپ نے ہم سے بیان کی تھی، تو امام اعمش نے کہا کہ ہم دوا فروش ہیں اور تم طبیب ہو''۔

۳۔ ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ امام صاحب سے کچھ حدیثیں مخفی رہ گئی ہوں۔ایسا بالکل ممکن ہے؛ کیوں کہ صحابۂ کرام مختلف شہروں اور ملکوں میں بکھر گئے تھے۔اور بعض حدیثیں ایسی بھی تھیں جو ایک جگہ تھیں، دوسری جگہ نہیں تھیں۔اور صحابہ وتابعین میں سے کسی نے یہ دعوی بھی نہیں کیا کہ اس نے کل احادیث کا احاطہ کر لیا ہے۔ایک دن شعبی سے کسی نوجوان نے کوئی روایت بیان کی۔شعبی نے کہا کہ میں نے تو یہ روایت کبھی نہیں سنی۔اس نوجوان نے پوچھا کہ کیا آپ نے کل حدیثیں سن رکھی ہیں؟ کہنے لگے نہیں تو، پھر اس نے پوچھا کہ کیا آدھی؟ انھوں نے کہا نہیں، آدھی بھی نہیں۔اس نوجوان نے کہا کہ یہ حدیث اس نصف حصے میں سے ہے جو آپ نے نہیں سنا''۔

یہ تو تابعین کی بات ہوئی۔خود بہت سے صحابہ سے بہت سی حدیثیں پوشیدہ رہیں۔حضرت عمر سے مجوسی پر جزیہ عاید کرنے اور ''وباء'' والی حدیث مخفی رہی۔حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے انھیں اس کے بارے میں بتایا۔اسی طرح وہ الاستیذان والی روایت سے بھی ناواقف رہے۔حضرت ابوموسی اشعری نے انھیں بتایا۔حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود تک تیمّم کی حدیث نہ پہنچ سکی، جو کہ حضرت عمار وغیرہ کو معلوم تھی۔حضرت عائشہ، حضرت ابن عمر اور حضرت

ابو ہریرہ سے مسح علی الخفین کی حدیث پوشیدہ رہی، جو حضرت علیؓ اور حضرت حذیفہؓ کو معلوم تھی۔اس طرح کی بہت سی احادیث بعض صحابہ سے مخفی رہیں؛لیکن کسی نے بھی ان حضرات کے بارے میں یہ نہیں کہا کہ وہ حدیث سے جاہل تھے۔بہت مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ کسی صحابی نے کوئی فیصلہ حدیث سے لاعلم ہونے کی وجہ سے حدیث کے خلاف کردیا؛لیکن بعد میں جب علم ہوا تو اپنے فیصلے سے رجوع کیا۔اس لیے امام ابوحنیفہ کو بھی اس میں معذور سمجھنا چاہیے۔

۴۔ امام صاحب کے زمانے میں حدیث میں جھوٹ بولنا عام ہو چلا تھا، جس کی وجہ سے آپ نے حدیث قبول کرنے میں بڑے سخت اور کڑے شرائط لگائے، جیسے:

(۱) شریعت کے مصادر کے گہرے مطالعے اور استقرا کے بعد آپ نے کچھ اصول متعین کیے تھے۔اور خبر آحاد کو قبول کرنے کی آپ نے یہ شرط لگائی تھی کہ وہ ان اصولوں سے ٹکراتی نہ ہو۔اگر کبھی ایسا ہوا تو آپ نے خبر آحاد کو شاذ سمجھ کر ترک کردیا اور اس اصول کو قوی تر سمجھتے ہوئے اس پر عمل کیا۔

(۲) خبر آحاد کتاب اللہ کے عموم اور ظاہر کے مخالف نہ ہو۔اگر ایسا ہوتا تو آپ خبر آحاد کو ترک کردیتے، الا یہ کہ اس سے قرآن کے مجمل کی تفسیر یا کسی نئے حکم کا ثبوت ہو رہا ہو تو اس پر عمل کرتے۔

(۳) حدیثِ مشہور کے مخالف نہ ہو۔

(۴) اس جیسی دوسری خبر آحاد کے معارض نہ ہو۔اگر ایسا ہوتا تو کسی وجہِ ترجیح کی وجہ سے آپ کسی ایک کو ترجیح دیتے۔ وجوہاتِ ترجیح میں اس طرح کی چیزیں تھیں کہ مثلاً ایک روایت کا صحابی دوسرے صحابی سے فقاہت میں بڑھا ہوا ہو، یا ایک فقیہ ہو اور دوسرا فقیہ نہ ہو، یا ایک جوان ہو اور دوسرا بوڑھا۔

(۵) خود راوی کا عمل اس روایت کے خلاف نہ ہو۔اسی وجہ سے آپ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی اِس روایت کو قبول نہ کیا کہ اگر کتا برتن چاٹ لے تو اسے سات مرتبہ دھویا جائے؛ کیوں کہ خود حضرت ابو ہریرہؓ کا فتوی اس روایت کے خلاف ہے۔

(۶) کوئی روایت کسی اضافے میں منفرد نہ ہو، چاہے یہ اضافہ متن میں ہو یا سند میں۔اگر ایسا ہوتا تو آپ اس روایت پر عمل کرتے جو اس زیادتی سے خالی ہوتی۔ایسا احتیاط کی وجہ سے کرتے۔

(۷) وہ خبر آحاد ایسی بات پر دلالت نہ کر رہی ہو جو عمومِ بلوی کی قبیل سے ہو؛اس لیے کہ اگر ایسا ہوتا تو یہ بات مشہور و متواتر ہوتی۔

(۸) وہ روایت ایسی نہ ہو کہ صحابہ میں اختلاف کے موقع پر کسی نے اس سے احتجاج نہ کیا ہو؛ کیوں کہ اگر وہ روایت ثابت ہوتی تو کوئی نہ کوئی صحابی اس سے احتجاج ضرور کرتا۔

(۹) سلف میں سے کسی نے پہلے اس روایت پر طعن نہ کیا ہو۔

(۱۰) حدود وعقوبات کے سلسلے میں جو مختلف روایات وارد ہوتیں، ان میں سے آپ اس روایت کو لیتے، جس میں ہلکی سزا کا ذکر ہوتا۔

(۱۱) روایت کے تحمل کے وقت سے اسے بیان کرنے تک راوی کے حافظے میں کوئی خلل نہ واقع ہوا ہو۔

(۱۲) وہ روایت ایسی نہ ہو جو صحابہ و تابعین کے متفقہ عمل کے خلاف ہو۔

(۱۳) راوی اپنی روایت کو یاد کیے بغیر صرف تحریر پر بھروسہ نہ کرتا ہو۔

یہ وہ کچھ اہم شرائط ہیں جو امام صاحب نے خبر آحاد کے قبول کرنے کے لیے لگائے ہیں۔محدثین ان میں سے اکثر کو اور فقہا ان میں سے بعض کو قبول نہیں کرتے ہیں۔اور اس وقت ہم اس سلسلے میں امام صاحب کی رائے کا دفاع کرنا بھی نہیں چاہتے۔ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ امام صاحب نے جن خبر آحاد پر عمل نہیں کیا، اس میں وہ معذور ہیں اور یہ ان کے اصولِ اجتہاد کی وجہ سے ہوا۔اب بھی اگر کوئی یہ الزام لگاتا ہے کہ امام صاحب نے ایسا خواہش نفس اور اتباع ہوی کے لیے کیا تو خدا کی پناہ! کہ امام صاحب جیسے متقی و پرہیزگار کے بارے میں کوئی ایسا تصور بھی کرے۔

☆☆☆

❑ مطالعات

زینب الغزالی کی تفسیر 'نظرات فی کتاب اللہ' ایک تعارف

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

مخالفینِ اسلام اور خاص طور پر اہلِ مغرب کی جانب سے یہ بات بڑے زور وشور سے کہی جاتی رہی ہے کہ اسلام نے حصولِ علم کے میدان میں عورت کی حوصلہ شکنی کی ہے اور اسے تعلیم وثقافت کی مجلسوں سے دور رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی پوری تاریخ میں علوم وفنون کے ارتقا میں مسلمان عورت کا کوئی قابلِ ذکر کردار نظر نہیں آتا۔ دینی علوم ہوں یا طبیعیاتی علوم؛ دونوں میدانوں میں وہ حاشیہ پر نظر آتی ہے اور کہیں بھی اس کی موجودگی دکھائی نہیں دیتی۔ یہ بات اتنی قوت اور تسلسل سے کہی جاتی رہی کہ اسے ایک ثابت شدہ حقیقت تسلیم کرلیا گیا اور اس کے نقد وجائزہ اور محاکمہ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ حالاں کہ اسلام نے حصول علم کے معاملے میں مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ مردوں کی طرح عورتیں بھی تمام طرح کے علوم حاصل کرسکتی ہیں اور اپنی علمی وعقلی صلاحیتوں سے سماج اور انسانیت کو فائدہ پہنچاسکتی ہیں۔ صدرِ اول میں خواتین نے اس میدان میں سرگرم کردار انجام دیا ہے۔ بعد کی صدیوں میں اگر ان کا کردار محدود ہوگیا اور وہ پس پردہ چلی گئیں تو اس کا قصوروار اسلامی تعلیمات کو قرار دینے کے بجائے اس کے اسباب ان تمدنی اور سماجی حالات میں تلاش کرنے چاہیں جو اس کے ذمہ دار ہیں۔ بہ ہر حال اس وقت ہم اردو داں حلقہ میں قرآن کریم کی ایک ایسی تفسیر پیش کرتے ہوئے خوشی ومسرت محسوس کررہے ہیں، جو ایک خاتون کی علمی وذہنی کاوش کا نتیجہ ہے۔ ہماری مراد عصر حاضر میں سرزمینِ مصر سے تعلق رکھنے والی عظیم داعیہ ومجاہدہ زینب الغزالی الجبیلی (م۲۰۰۵ء) کی تفسیر 'نظرات فی کتاب اللہ' سے ہے۔

زینب الغزالی کی ولادت جنوری ۱۹۱۷ء میں مصر کے ایک گاؤں میں ہوئی۔ ان کے والد علمائے ازہر میں سے تھے۔ انھوں نے ان کی بہت اچھی دینی تربیت کی۔ وہ ان کے سامنے نام ور صحابیات کے واقعات بہت اثر انگیز انداز میں بیان کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے زینب کے سامنے مشہور صحابیہ حضرت نسیبہ بنت کعب المازنیہ رضی اللہ عنہا، جنھوں نے غزوۂ احد میں نہایت بے جگری سے رسول اللہ ﷺ کا دفاع کیا تھا، نام ور عرب خاتون باحثہ البادیہ اور آزادیٔ نسواں کی علم بردار مصری خاتون ہدیٰ شعراوی کے حالات بیان کیے۔ پھر سوال کیا کہ تم ان میں سے کس کو اپنا نمونہ بناؤ گی؟ زینب نے فوراً حضرت نسیبہ رضی اللہ عنہا کا نام لیا۔ ابھی وہ گیارہ سال کی تھیں کہ والد کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا۔

زینب الغزالی نے سرکاری اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ذاتی طور پر علمائے ازہر سے بھی کسبِ فیض کیا۔ان کے اساتذہ میں شیخ عبد المجید اللبان، شیخ محمد سلیمان النجار اور شیخ علی محفوظ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ابتدا میں زینب کا تعلق ہدیٰ شعراوی کی قائم کردہ تنظیم الاتحاد النسائی سے ہوگیا، جو آزادیٔ نسواں کے میدان میں بہت سرگرم تھی،لیکن جلد ہی انھوں نے اس سے علیحدگی اختیار کرلی اور ۱۹۳۷ء میں جمعیۃ السیدات المسلمات قائم کی۔اس وقت ان کی عمر صرف بیس سال تھی۔اس تنظیم نے مصری خواتین کی دینی تربیت واصلاح کے میدان میں اہم خدمات انجام دیں۔ پورے مصر میں اس کی شاخیں قائم تھیں۔السیدات المسلمات کے نام سے اس کا ایک مجلّہ نکلتا تھا، جو خواتین کے درمیان بہت مقبول تھا۔ اس تنظیم کی خدمات ربع صدی کے عرصہ کو محیط ہیں۔اس سے وابستہ خواتین کی تعداد تیس لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ زینب مسجد ابن طولون میں ہر ہفتہ خواتین کے درمیان قرآن مجید کا درس دیا کرتی تھیں۔اس میں تین ہزار سے پانچ ہزار تک خواتین شریک ہوتی تھیں۔

اسی زمانے میں مصر میں الاخوان المسلمون کے نام سے ایک تحریک ابھری، جسے نوجوانوں میں بہت مقبولیت حاصل تھی۔اس کے بانی شیخ حسن البنا شہید رحمۃ اللہ علیہ نے خواتین میں کام کرنے کے لیے الگ شعبہ قائم کیا تو ان کی خواہش ہوئی کہ زینب الغزالی اپنی الگ تنظیم ختم کرکے اخوان کے شعبۂ خواتین 'الاخوات المسلمات' کی ذمے داری سنبھال لیں۔اس وقت موصوفہ اپنی تنظیم کی مجلس شوریٰ سے مشورے کے بعد اسے توڑنے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ بعد میں جب شاہ فاروق کے دور میں پہلی مرتبہ اخوان حکومتی عتاب کا شکار ہوئے تو زینب الغزالی نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے سیدات مسلمات کو ختم کرکے اخوات مسلمات کی قیادت کے تحت کام کرنے کا فیصلہ کیا۔لیکن اس وقت امام حسن البنّا نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے موصوفہ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی علیٰحدہ تنظیم قائم رکھیں، اس لیے کہ مستقبل میں اس کا علیٰحدہ وجود ضروری ہے۔اس کا فائدہ یہ ہوا کہ 1948 میں جب اخوان کو خلافِ قانون قرار دیا گیا، پھر 1954ء میں جمال عبد الناصر کے زمانے میں اخوان پر دوبارہ کاری ضرب لگائی گئی تو ان حالات میں سیدات مسلمات ہی واحد تنظیم تھی جو میدان میں سرگرم عمل تھی اور قید وبند کے شکار اخوان کے خاندانوں کو سہارا دے رہی تھی۔اس وقت پورے مصر میں اس کی ایک سو بیس شاخیں تھیں اور غریب اور ضرورت مند خاندانوں کی مالی امداد اس کا شعار تھا۔آخر کار جمال عبد الناصر نے 1964ء میں السیدات المسلمات پر بھی پابندی عائد کردی اور زینب الغزالی کو داخلِ زنداں کردیا۔جیل میں ان پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے گئے اور تشدد اور ایذا رسانی کا ہر حربہ آزمایا گیا،لیکن ان کے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش نہ آئی اور وہ صبر وعزیمت کا پہاڑ بنی رہیں۔انھیں پچیس سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی، مگر چھ سال کے بعد 1971ء میں انور سادات کے زمانۂ صدارت میں انہیں رہائی مل گئی۔

جیل سے رہائی کے بعد زینب الغزالی اخوان کے ترجمان الدعوۃ میں خواتین اور بچوں کے کالم کی ایڈیٹر رہیں۔انھوں نے دعوت واصلاح، خواتین کی ذمہ داریاں اور دائرہ کار، نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے مسائل اور دیگر تحریکی موضوعات پر خوب لکھا۔ ان کی متعدد کتابیں اور مقالات کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور مختلف زبانوں میں ان کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

زینب الغزالی کے علمی کاموں میں سب سے زیادہ اہمیت

ان کی تفسیر 'نظرات فی کتاب اللہ' کو حاصل ہے۔ اس کا شمار بیسویں صدی عیسوی میں دعوتی وتحریکی اسلوب میں لکھی جانے والی اہم تفسیروں میں ہوتا ہے، لیکن ایک دوسرے پہلو سے بھی اس کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ غالباً یہ کسی خاتون کے قلم سے لکھی جانے والی واحد مکمل تفسیر ہے۔ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں یہ شرف کسی اور خاتون کو حاصل نہیں ہوا ہے۔ جیل کی تنہائیوں میں قرآن کریم ہی زینب الغزالی کا روحانی سہارا تھا۔ وہ تلاوتِ قرآن کے دوران برابر اس کے معانی میں غور وخوض کرتی رہتیں اور جو کچھ اللہ تعالی ان پر القا کرتا اسے مصحف کے حواشی اور بین السطور میں لکھ لیتیں۔ جیل سے رہائی پر ان کا وہ مصحف تو انھیں نہیں مل سکا، لیکن بعد میں جب انھوں نے تفسیر لکھنی شروع کی تو حافظہ پر زور دے کر ان معانی وافکار کا استحضار کیا اور انھیں اپنی تفسیر میں شامل کیا۔ محترمہ غزالی گزشتہ صدی کی نویں دہائی کے اوائل ہی میں اس تفسیر کو مکمل کر چکی تھیں۔ جامعہ ازہر کے استاذِ تفسیر عبدالحی الفرماوی نے اس کا مراجعہ کیا اور اس کی پہلی جلد (711 صفحات)، جو سورۂ ابراہیم تک کی تفسیر پر مشتمل تھی، دار الشروق قاہرہ سے 1994 / 1414 میں شائع ہوئی۔ بعد میں اس کے مالک الاستاذ محمد المعلم کے انتقال کے بعد دوسری جلد شائع نہیں ہوسکی تھی۔ ابھی حال میں مکمل تفسیر (1300 صفحات) کی اشاعت دار التوزیع والنشر الاسلامیۃ قاہرہ سے ہوئی ہے۔

تفسیر 'نظرات فی کتاب اللہ' کی امتیازی خصوصیات کو درج ذیل نکات کی شکل میں بیان کیا جاسکتا ہے:

1_ اس تفسیر میں قدیم ماثور کتبِ تفسیر سے استفادہ کیا گیا ہے، مثلاً تفسیر ابن کثیر، تفسیر قرطبی، تفسیر ابی سعود وغیرہ۔ خاص طور سے محترمہ نے تفسیر ابن کثیر سے اپنے گہرے تاثر کا اظہار کیا ہے۔ جدید تفسیروں میں انہوں نے تفسیر آلوسی اور تفسیر قاسمی سے استفادہ کیا ہے۔ تفسیر رازی بھی ان کے پیش نظر رہی ہے۔ سید قطب کی تفسیر 'فی ظلال القرآن' کا بھی وہ جابہ جا حوالہ دیتی ہیں، بلکہ دعوتی اور ادبی اسلوب دونوں میں قدر مشترک ہے۔

2_ یہ تفسیر، ماثور تفسیر کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ آیات کی تفسیر میں اسی مضمون کی دیگر آیات پیش کی گئی ہیں، صحیح احادیث اور اقوال صحابہ کی روشنی میں تشریح کی گئی ہے اور تائید میں تابعین اور علمائے سلف کے حوالے دیے گئے ہیں، مثلاً سورۂ بقرہ کے آغاز میں 'تقویٰ' کی تشریح میں پہلے سورۂ آل عمران کی ایک آیت پیش کی ہے، پھر ایک حدیث نقل کی ہے اور آخر میں حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کے اقوال ذکر کیے ہیں۔

3_ اس تفسیر میں عموماً لغوی اور تاریخی تفصیلات اور فقہی اختلافات سے گریز کیا گیا ہے اور آیات کے عام مفہوم پر اکتفا کیا گیا ہے۔ مثلاً آیت 'حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطٰى' (البقرۃ:۸۳۲) کی تفسیر میں محترمہ نے لکھا ہے: ''صلوٰۃ وسطیٰ سے کون سی نماز مراد ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالی نے خود اسے متعین نہیں کیا ہے، تاکہ مسلمان تمام نمازوں کی حفاظت کریں۔ کون سی نماز دوسری نمازوں سے افضل ہے؟ اس کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔''

4۔ اس تفسیر کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں آیات کی تفسیر حالاتِ حاضرہ سے جوڑ کر کی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ کی آیات (۲۶۲-۲۷۴) میں تفصیل سے انفاق اور صدقہ وخیرات کا تذکرہ ہوا ہے، پھر سود کی حرمت بیان کی گئی ہے۔ (آیات: ۲۷۵-۲۷۶) اس کے بعد زکوۃ ادا کرنے والوں کے لیے اللہ تعالی کے اجر وانعام کا وعدہ کیا گیا ہے۔ (آیت: ۲۷۷) اس ذیل میں محترمہ نے لکھا ہے: 'ہمارے درمیان اب

فریضۂ زکوۃ کی ادائی میں بہت زیادہ لاپروائی ہونے لگی ہے اور یہ چند نیک لوگوں کا انفرادی عمل بن کر رہ گیا ہے، جسے وہ کھلے یا چھپے انجام دیتے ہیں۔ اور سود پر مبنی نظام کی تاریکیاں سماج میں چھا گئی ہیں، جن میں لوگ ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں اور اس کے کڑوے کسیلے پھل کھا رہے ہیں۔''

5۔ دیگر تفسیروں کے مقابلے میں اس تفسیر کا ایک امتیاز یہ ہے کہ یہ ایک خاتون کی تحریر کردہ ہے۔ اسی لیے اس میں حقوقِ نسواں سے تعلق رکھنے والی آیات کی عمدہ تفسیر ملتی ہے اور قاری کے سامنے نسائی اپروچ نمایاں ہوکر سامنے آتی ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ البقرۃ: ۲۳۴ میں جن عورتوں کے شوہروں کی وفات ہوجائے، ان کی عدت چار ماہ دس دن بیان کی گئی ہے۔ اس کی تفسیر میں محترمہ لکھتی ہیں کہ ''حاملہ عورت کا حکم اس سے مختلف ہے۔ اگر شوہر کی وفات کے چند دنوں کے بعد وضع حمل ہوجائے تو اس عورت کی عدت مکمل ہوگئی۔ اب وہ آزاد ہے، سوگ کا لباس پہننا ضروری نہیں، وہ اب زیب وزینت اختیار کرسکتی ہے اور دوسری شادی کی خواہش کا اظہار کرسکتی ہے۔ اس کے اس رویے پر ہمیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا''۔ تائید میں انھوں نے حضرت سبیعہ الاسلمیہ (زوجہ حضرت سعد بن خولہ رضی اللہ عنہ) کا واقعہ نقل کیا ہے کہ ان کے شوہر کی وفات کے چند دنوں کے بعد ان کا وضع حمل ہوگیا تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تمہاری عدت پوری ہوگئی۔ اب اگر تم چاہو تو دوسرا نکاح کرسکتی ہو۔ (مسلم)

6۔ حقیقت میں یہ ایک دعوتی تفسیر ہے۔ محترمہ نے قرآن کریم کے معانی اور احکام کو حالاتِ حاضرہ سے جوڑ کر بیان کیا ہے۔ وہ مسلمانوں میں پائی جانے والی کم زوریوں کی نشان دہی کرتی ہیں اور اللہ کے دین کی طرف رجوع کرنے اور کتاب وسنت کو مضبوطی سے پکڑنے کو ان کا علاج بتاتی ہیں۔ فرد کی اصلاح وتربیت، خاندان اور سماج کی صالح بنیادوں پر تعمیر اور امت مسلمہ کی تشکیل کا پہلو کبھی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ گزشتہ قوموں کے واقعات اور خاص طور پر اہل کتاب سے متعلق آیات کی تشریح وتفسیر کرتے ہوئے وہ مسلمانوں کے لیے درس وعبرت کے پہلو کو ضرور نمایاں کرتی ہیں۔

یہ واضح رہے کہ مرحومہ زینب الغزالی کی اس تفسیر میں بعض مقامات پر ان کے نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے: ''جنت آپؐ ہی کے لیے تخلیق کی گئی ہے اور آپؐ ہی کے ذریعے ہم جنت میں داخل ہوں گے۔ آپؐ کے علاوہ کسی دوسرے کے ذریعے ہم اس جنت کو دیکھ نہیں پائیں گے۔'' (تفسیر سورۂ النساء: ۴۱۰) یا اصحاب السبت میں سے جو لوگ برائی سے روکتے تھے اور جو لوگ خاموش رہے تھے، دونوں کو انہوں نے عذاب سے نجات پانے والا قرار دیا ہے۔ (تفسیر سورۂ الاعراف: ۱۶۵) جب کہ اہل تفسیر صرف ان لوگوں کو نجات یافتہ قرار دیتے ہیں جو برائی سے روکتے تھے۔ اس طرح کے کچھ اور مقامات ہوسکتے ہیں۔

مقامِ مسرت ہے کہ مکمل تفسیر کی اشاعت کے کچھ ہی عرصہ کے بعد یہ اردو قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ رہی ہے۔ ڈاکٹر عبدالحمید اطہر ندوی ذی علم، باصلاحیت اور محنتی نوجوان ہیں۔ اس سے قبل متعدد عربی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرچکے ہیں۔ امید ہے ان کی اس علمی کاوش کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور اس سے بھرپور استفادہ کیا جائے گا۔

☆☆☆

❑ مطالعات

زجاجۃ المصابیح — ایک معروضی مطالعہ

صداقت علی قاسمی مظاہری
مدرس مدرسہ امینیہ، دہلی

محدث دکن، فخر المحدثین سیّد عبد اللہ شاہ نقشبندی حیدرآبادیؒ (پ ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۲ء۔ ت ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴ء) کی مایہ ناز تصنیف زجاجۃ المصابیح برصغیر میں لکھی گئی حدیث کی کتابوں میں ایک اہم اور بلند درجہ کی کتاب ہے۔ جسے مشکاۃ المصابیح کے طرز پر بطور استدراک مرتب کیا گیا ہے۔ کتاب بلند پایہ علمی حیثیت کی حامل ہے۔ خاص طور پر فقہ حنفی کے مستدلات اور ان کی تائیدی روایات کے وافر ذخیرہ نیز غیر موافق روایات واعتراضات کی جرح وتنقید پر مشتمل ہونے کی وجہ سے، اسے علمی حلقوں میں غیر معمولی مقبولیت اور پذیرائی حاصل رہی ہے۔ پوری کتاب مصنف کی فن حدیث میں کامل مہارت اور علم فقہ میں کامل بصیرت کی آئینہ دار ہے، اور ہندوستانی علماء کے زریں اور قابل قدر کارناموں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔

مصنف کا تعارف: زجاجۃ المصابیح کے مصنف ابوالحسنات سید عبد اللہ شاہ نقشبندی حیدرآبادی سرزمینِ دکن کی نادر روزگار شخصیات میں سے ایک ہیں، جو بیک وقت ایک صاحب دل صوفی، ماہر عالم دین، کامیاب مدرس اور بے مثال خطیب تھے۔ نسباً آپ امیر المومنین سیدنا علیؓ کی اولاد امجاد میں تھے۔

آپ کا خاندان علم وفضل اور دین داری وتقوی شعاری کے حوالے سے جنوبی ہند کے ممتاز خاندانوں میں شمار ہوتا ہے۔ آپ کے مورثِ اعلی شیخ سید علیؒ سلطان عادل شاہ کے عہد حکومت میں مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے ہندوستان تشریف لائے اور بیجاپور میں قیام فرمایا۔ تمام عمر قلعہ نلدرک کی مسجد میں امامت وخطابت کے منصب پر فائز رہے اور یہیں وفات پائی۔ بعد کے زمانے میں آپ کا خاندان بیجاپور سے منتقل ہوکر حیدرآباد آ گیا اور یہیں سکونت پذیر ہوگیا، اس وقت سے آج تک اس خانوادے کی دینی عظمت وتقدس اہالیان حیدرآباد کے قلوب میں جاگزیں چلی آرہی ہے۔ علم وفضل سے بھرے پرے اور دینی شرافت ونجابت سے متصف ایسے خانوادے میں ۱۰ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ/۶ فروری ۱۸۷۲ء کو محلّہ حسینی علم حیدرآباد دکن میں سید عبد اللہ شاہ کی پیدائش ہوئی۔

آپ کے والد ماجد مولانا سید مظفر حسین اپنے علاقے کے مشہور عالم دین اور صاحبِ نسبت بزرگ تھے، جن کے سایۂ عاطفت میں آپ کو شروع ہی سے دینی و روحانی تربیت میسّر آئی، چنانچہ آپ نے عربی، فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی، اور علم منطق وفلسفہ میں مولانا

منصور علی خان سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد جامعہ نظامیہ حیدرآباد کے بانی ومؤسّس مولانا محمد انوار اللہ فاروقیؒ (ت ۱۳۶۳ھ) کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور علوم نقلیہ و عقلیہ کی تکمیل کی۔ حدیث اور متعلقات حدیث کا علم حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری (ت ۱۲۹۷ھ) کے فرزند ارجمند مولانا عبد الرحمان سہارنپوری (ت ۱۳۴۶ھ) سے حاصل کیا اور خداداد صلاحیت کی وجہ سے اعلی درجے کی مہارت پیدا کی اور اجازتِ حدیث سے سرفراز ہوئے۔

تحصیل علم کے بعد آپ نے درس و تدریس کی شروعات کی، چنانچہ محلّہ حسینی علم کی مسجد ''علی آقا'' میں اپنا حلقہ درس قائم کیا اور تمام عمر اسی مشغلہ میں بسر کردی۔ آپ کے درس حدیث کو غیر معمولی مقبولیت وشہرت حاصل ہوئی، چنانچہ علما و طلبہ کی ایک بڑی تعداد نے فن حدیث میں آپ سے کسب فیض کیا اور سند حدیث حاصل کی۔ آپ سے سند حدیث پانے والوں میں شام کے مشہور محدّث شیخ عبدالفتّاح ابوغدّہؒ (۱۴۱۷ھ) بھی شامل ہیں، جنھوں نے ہندوستان کے سفر کے دوران حیدرآباد حاضری کے موقع پر آپ کے درس حدیث میں شرکت کرکے اجازت حدیث حاصل کی تھی۔ آپ کے درس حدیث کو یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ آپ کے درس میں علماء وطلبہ کے علاوہ عوام اور عمائدین شہر کی ایک بڑی جماعت بھی نہایت شوق و ذوق کے ساتھ شریک ہوا کرتی تھی۔ علم حدیث میں کامل دستگاہ اور غیر معمولی مہارت کی بنا پر آپ کو محدّث دکن کے لقب سے پکارا گیا، اور یہ لقب اس قدر مشہور ہوا کہ آپ کے نام کا جز بن کر رہ گیا۔

درس و تدریس کے علاوہ وعظ و ارشاد اور تقریر و خطابت سے بھی آپ کو حد درجہ مناسبت تھی، بلکہ عوامی حلقوں میں تو آپ ایک دردمند مصلح اور شریں بیاں واعظ ہی کی حیثیت سے متعارف تھے۔ آپ نے اپنے عوامی وعظوں کے ذریعہ بھی اصلاح وارشاد کا بڑا کام انجام دیا اور عوام کے دلوں میں اتباع شریعت کا جذبہ پیدا کرنے اور بدعات وخرافات سے نفرت دلوں میں بٹھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

آپ کی شخصیت کا ایک روشن عنوان تصوف و سلوک کی معرفت اور اس کوچے کی صدر نشینی بھی ہے۔ آپ سلوک ومعرفت کے بلند مقام پر فائز اور سلسلۂ قادریہ و نقشبندیہ میں اجازت وخلافت سے سرفراز تھے۔ اتباع سنت کا خصوصی ذوق آپ کو ورثہ میں ملا تھا اور سفر وحضر میں نماز با جماعت کا شدّت سے اہتمام تو آپ کی ایسی خصوصیت رہی ہے کہ جس پر شدید بیماری کے زمانے میں بھی عمل ترک نہیں ہوا، جبکہ آپ کی عمر مبارک ۹۰ سال سے متجاوز ہوچکی تھی۔ عبادات میں پختگی کے ساتھ ساتھ معاملات، اخلاق، معاشرت اور رہن سہن میں بھی آپ مکمل طور پر شریعت کے سانچے میں ڈھلے ہوے تھے۔ غرض آپ علم وعمل کی جامعیت کے حوالے سے ''درکفِ جامِ شریعت درکف سندانِ عشق'' کا حقیقی مصداق تھے۔ حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند (ت ۱۴۰۳ھ) نے آپ کو اتقیائے دکن میں سے قرار دیا ہے۔ اِس راہ سے بھی آپ نے خلق خدا کو فیضیاب فرمایا اور بے شمار بندگان خدا کو تزکیہ نفس کی دولت سے سرفراز کرکے دین داری و پرہیزگاری کی راہ پر گامزن کیا۔ آپ کی علمی وعملی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ زجاجۃ المصابیح کی تصنیف ہے، اس کے علاوہ سیرت، تفسیر، تزکیہ اور وعظ وارشاد کے مختلف موضوعات پر اردو زبان میں ۱۳/ کتابیں بھی آپ کی علمی یادگار ہیں۔ علم وعمل سے معمور کامیاب زندگی گزار کر ۱۸ ربیع الثانی ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۹۶۴ء بروز جمعرات ۹۲ /سال کی عمر میں رحلت فرمائی، نقشبندی چمن مصری گنج حیدرآباد میں آپ کا مزار پر انوار مرجعِ خلائق ہے۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

سببِ تالیف: زجاجۃ المصابیح کی اصل نبیاد خطیب تبریزیؒ (ت ۷۴۱ھ) کی کتاب مشکاۃ المصابیح ہے، جو اپنے مشمولات اور گوناگوں ظاہری ومعنوی خصوصیات کی بنیاد پر ہر زمانے میں مقبولِ خاص وعام رہی ہے۔ مشکاۃ کے نام سے حدیثوں کا یہ مجموعہ اگرچہ دین کے ابتدائی تعارف اور مشغول زندگی کے لیے احادیث نبویہ سے علمی وعملی تعلق پیدا کرنے کی غرض سے معرض وجود میں لایا گیا تھا، مگر مصنف کے فقہی مسلک کا اثر بھی اس میں در آیا ہے، اور حدیثوں کی جمع وتالیف اور ابواب کی ترتیب وتنسیق کا عمل بھی کافی حد تک اس سے متاثر ہوا ہے، چنانچہ پورے مجموعے پر طائرانہ نظر ڈالنے ہی سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس میں احکام ومسائل کے باب میں ان حدیثوں کو جمع کیا گیا ہے جو شافعی مسلک کی تائید کرتی ہیں اور بہت سی وہ حدیثیں جن سے دوسرے مکاتبِ فکر خاص طور پر احناف استدلال کرتے ہیں اس میں آنے سے رہ گئی ہیں۔ اس لیے شدت سے ضرورت محسوس کی جاتی تھی کہ مشکاۃ ہی کے طرز پر احادیث نبویہ کا ایک ایسا مجموعہ تیار کیا جائے جس میں بطورِ خاص ذخیرہ احادیث سے ان حدیثوں کو جمع کیا جائے جو فقہ حنفی کے مستدل کے طور پر استعمال ہوتی ہیں، نیز ان پر ہونے والے اعتراضات اور غیر موافق روایات کا اصول جرح وتعدیل کی روشنی میں منصفانہ جائزہ بھی لیا جائے۔ یہی ضرورت اس کتاب کی تالیف کا محرک بنی۔ اور اسی نے مصنف کے دل میں اس اہم کام کو انجام دینے کا خیال پیدا کیا۔ چنانچہ کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

وَلَـمَّـا سَـلَکَ الْخَطِيْبُ رَفَعَ اللّٰهُ دَرَجَتَهُ فِـی تَـصْـنِيْـفِـهِ مَسْـلَکَ الْائِمَامِ الشَّافِعِيِّ ، كَثِيْراً مَّا كَـانَ يَـخْتَـلِـجُ فِـيْ قَـلْـبِـيْ أَنْ أُؤَلِّفَ كِتَاباً عَلىَ مِنْوَالِ (الْـمِشْكَاةِ) أَسْلُکُ فِيْهِ مَسْلَکَ أَمَامِنَا الْأَعْظَم أَبِي حَنِيْفَةَ النُّعْمَان۔عَلَيْهِ الرَّحْمَةُ وَالرِّضْوَانُ.

''چوں کہ خطیب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف میں امام شافعیؒ کے مسلک کی پیروی کی ہے، اس بنا پر بار بار میرے دل میں خیال پیدا ہوتا تھا کہ میں مشکاۃ کے طرز پر ایک کتاب لکھوں جس میں امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کی پیروی کروں''۔

لیکن اس کام کی عظمت شان اور دشواریوں کو دیکھتے ہوئے مصنف ایک عرصے تک پس وپیش میں مبتلا رہے کہ ایک ایسی بات پیش آگئی جس سے یہ مشکل آسان ہوتی چلی گئی۔ مقدمہ میں ہی لکھتے ہیں:

أَلَّا أَنَّ ضِيقَ بَـاعِـي قَـدْ كَـانَ يَثْبُطُنِي (أَيْ يَشْـغُـلُـنِـي)عَـنِ الْـقِيَـامِ فِـي هَذَا الْمَقَامِ، حَتّٰى رَأَيْتُ فِـي الْـمَـنَـامِ أَنَّ شَـمْـسَ الـضُّـحـىَ وَبَدْرَالدُّجـىَ وَنُـورَالهُـدَى، وَمِـصْبَـاحَ الـظُّـلَـمِ حَبِيْبَـنَـا الـنَّبِـيَّ الْأَكْـرَمَ ﷺ طَـلَعَ عَلَيَّ وَقَالَ: سَلَامًا، قُلْتُ: سَلَامًا، فَـضَـمَّـنِـي رُوْحِـي فِـدَاهُ. أَلٰى صَدْرِهِ الَّذِي هُوَ مَنْبَعُ الْعِلْمِ وَالْحِكَمِ وَعَانَقَنِي.

فَـلَـمَّـا اسْتَقْقَظْتُ فَرَحًا وَمَسْرُوْرًا حَمِدتُّ الـلّٰـهَ عَـلَى هَذِهِ النِّعْمَةِ وَشَكَرْتُ لَهُ، فَأَصْبَحَتْ هَذِهِ الـرُّؤْيَـا الـصَّـالِـحَةُ شَرْحًا لِي صَدْرِي، وَصارَ عُسْرُهُ عَـلَـيَّ بِهَا يُسْرِي، فَصَمَمْتُ عَزْمِي بِتَأْلِيْفِهِ وَشَدَدتُّ مِـيْـزَرِي لِكِتَابَتِهِ، وَمَا وَضَعْتُ فِيهِ حَدِيْثًا أَلَّا وَصَلَّيْتُ عَـلَـى الـنَّبِـيِّ ﷺ عِـنْـدَ وَضْعِـهِ. وَسَمَّيْتُـهُ(زُجَـاجَةَ الْمَصَابِيْحِ)۔

''لیکن میری بے مائگی اور کم علمی اس اہم کام کو انجام دینے سے مانع بنتی تھی، یہاں تک کے میں نے خواب دیکھا کہ آفتاب رسالت، ماہتاب نبوت، ہدایت کے نور، تاریکیوں کے روشن چراغ، محبوب دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے اور سلام کیا، میں نے

جواب دیا۔اس کے بعد آپؐ نے مجھے اپنے سینۂ مبارک سے لگایا جو علم وحکمت کا سرچشمہ ہے، اور آپ نے مجھ سے معانقہ کیا۔ یہ خواب دیکھنے کے بعد میں فرحت وشادمانی سے سرشار ہوکر بیدار ہوا، اس نعمت پر اللہ کی حمد کی اور اس کا شکر ادا کیا، چنانچہ یہ نیک خواب میرے لیے شرح صدر کا باعث بن گیا اور اس کی برکت سے مشکل کام میرے لیے آسان ہوگیا اور میں نے اس کتاب کی تالیف اور تدوین کا پختہ ارادہ کرلیا اور اس کام کے لیے کمر ہمت کس لی۔ میں نے اس کتاب میں کوئی حدیث ایسی نہیں شامل کی جس کو نقل کرتے وقت میں نے درود پاک پڑھنے کا اہتمام نہ کیا ہو اور میں نے اس کتاب کا نام ''زجاجۃ المصابیح'' رکھا۔

اس خواب کو مصنف نے کام کے سلسلے میں فالِ نیک سمجھتے ہوئے، نہایت ہی ہمت وحوصلے اور تندہی و جاں فشانی کے ساتھ زجاجۃ المصابیح کی تالیف کا عمل شروع کردیا۔ ہر حدیث لکھتے وقت درود پاک کے ورد کا اہتمام کیا گیا اور اس طرح روحانیت وللّٰہیت کے ماحول میں یہ گراں قدر اور قیمتی شاہ کار وجود میں آیا۔

تعارف وتجزیہ: زجاجۃ المصابیح کی تالیف وترتیب ۱۳۶۸ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اور پہلی مرتبہ اس کی اشاعت پانچ جلدوں میں حیدرآباد دکن سے ۱۳۷۱ھ سے ۱۳۸۰ھ کے درمیان عمل میں آئی۔ دوسری مرتبہ ۱۴۲۲ھ میں مکتبہ خیریہ کوئٹہ پاکستان نے اس کو پہلے ایڈیشن کے مثنیٰ اور مثل ہی کے طرز پر شائع کیا، لیکن کتاب کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر ضرورت تھی کہ اسے جدید طرز پر شائع کیا جائے، تاکہ اس سے استفادے کا دائرہ وسیع ہوسکے۔ مقامِ شکر ہے کہ ماضی قریب میں پاکستان کے مشہور اشاعتی ادارے مکتبہ البشریٰ کراچی نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور اسے تحقیق و تعلق، رموز املا ورموزِ اوقاف کی رعایت اور ملون حروف و عبارات جیسی نمایاں خصوصیات کے ساتھ جدید طرز اور خوبصورت انداز میں چار جلدوں میں شائع کیا ہے۔ پہلی جلد کتاب الایمان سے باب الاعتکاف تک ۶۳۶/صفحات پر مشتمل ہے، جس میں ۲۵۶۳/حدیثیں ذکر کی گئی ہیں، دوسری جلد کتاب فضائل القرآن سے باب فی النذور تک ۵۴۳/صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں ۹۱۷/حدیثیں ذکر کی گئی ہیں، تیسری جلد کتاب القصاص سے کتاب الرؤیا تک ۴۱۰/صفحات پر مشتمل ہے، جس میں ۹۸۰/حدیثیں ذکر کی گئی ہیں، چوتھی جلد میں کل ۶۷۷ صفحات ہیں جس میں ۱۰۹۶/ حدیثیں ذکر کی گئی ہیں، لیکن یہ جلد چوتھے اور پانچویں دو جزوں کو شامل ہے، جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔ چوتھا جز کتاب الآداب سے کتاب الفتن باب بدء الخلق و ذکر الأنبیاء کے ختم تک ۳۶۸/صفحات پر مشتمل ہے جس میں ۱۰۵۳/حدیثیں ذکر کی گئی ہیں۔ پانچواں جز کتاب الفضائل سے باب ثواب ہذہ الامۃ تک ۲۹۹/صفحات پر مشتمل ہے جسمیں ۵۴۳/حدیثیں ذکر کی گئی ہیں، چاروں جلدوں کے مجموعی صفحات ۲۲۶۶/اور کل حدیثیں ۶۰۵۶/ہیں۔

زجاجۃ المصابیح کی ترتیب میں وہی نہج اختیار کیا گیا ہے، جو مشکاۃ کے مصنف نے اپنی کتاب میں اختیار کیا ہے۔ البتہ دونوں کے نہج میں دو باتوں میں فرق ہے۔ (۱) خطیب تبریزی نے اپنی کتاب کی بنیاد ان حدیثوں پر رکھی ہے جن سے شافعی مسلک کی تائید ہوتی ہے، جبکہ زجاجہ کی بنیاد ان حدیثوں پر رکھی گئی ہے، جن سے حنفی مسلک کی تائید ہوتی ہے۔ (۲) مشکوٰۃ میں تین مختلف فصلیں ہوتی ہیں۔ جن میں مسئلے کی حدیثیں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں، جبکہ زجاجۃ میں مسئلہ کی تمام حدیثیں ایک ہی فصل میں جمع کردی گئی ہیں۔ ان دو باتوں کے علاوہ تقریباً تمام امور میں یہاں تک کہ وضع وترتیب اور تبویب وتفصیل تک میں بھی مشکاۃ ہی کے طرز کی پیروی کی گئی ہے،

باب کے شروع میں اور حدیثوں کو نقل کرنے کے دوران جس چیز کی ضرورت محسوس کی گئی اس کو بطور استدراک درج کیا گیا ہے نیز حدیث کی کتابوں کے حوالے (بطور خاص احناف کے ذریعہ لکھی گئی کتابوں کے حوالے) بڑھائے گئے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب مشکوٰۃ کے متن اور نائب اور اس پر مستدرک و مستخرج کی حیثیت اختیار کر گئی ہے، اور احناف کے حلقوں میں تو اسے حنفی مشکاۃ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

امتیازات وخصوصیات: زجاجۃ المصابیح بہت سی خصوصیات اور امتیازات کی حامل ہے، جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) مصنف نے اس کتاب میں فقہی ابواب کی ترتیب سے ہر باب کی متعلقہ روایات عمدہ ترتیب کے ساتھ جمع کی ہیں اور ان پر استدلال کرنے، نیز مقصد حدیث کا مآخذ قرآن سے پیش کرنے کی غرض سے ہر کتاب اور باب کے شروع میں قرآن کریم کی آیات ذکر کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

(۲) حنفی مسائل کے بنیادی مآخذ اور ان کی تائید میں احادیث وسنن، نیز صحابہ کے آثار اور فتاویٰ کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

(۳) سب سے پہلے وہ حدیثیں ذکر کی ہیں، جو ترجمۃ الباب پر مطابقۃً دلالت کرتی ہیں پھر وہ حدیثیں جو تضمناً دلالت کرتی ہیں اور آخر میں وہ حدیثیں نقل کی ہیں جو التزاماً دلالت کرتی ہیں۔

(۴) فقہی مسائل واحکام سے تعلق رکھنے والی حدیثوں کو مناسب ترتیب سے ذکر کیا ہے، چنانچہ سب سے پہلے وہ روایتیں نقل کی ہیں جو مفتیٰ بہ مذہب کے موافق ہیں، پھر وہ جو ان کی تائید ومتابعت کرتی ہیں، ایسے مقامات پر بعض جگہ متن کتاب ہی میں احناف کے مستدلات پر وارد ہونے والے اعتراضات کی تردید کی ہے نیز غیر موافق روایات کے راویوں پر اصول جرح وتعدیل کی روشنی میں تنقید اور ان روایات سے ان کے استدلال کی کمزوری کی وضاحت کرتے ہوئے ان کا صحیح محمل اور مقام ومرتبہ متعین کیا ہے۔

(۵) اکثر جگہوں پر حواشی لکھنے کا اہتمام کیا ہے، جن میں قابل توضیح امور بالخصوص احناف کے مسلک کی مستند ومعتبر کتابوں کے حوالے سے مکمل وضاحت، نیز اس کی تائید میں اجمالاً یا تفصیلاً دلائل ذکر کئے ہیں۔

زجاجۃ المصابیح کی یہ چند اہم اور بنیادی خصوصیات ہیں جو مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر یہاں نقل کر دی گئیں۔ ورنہ اس کتاب کے حقیقی محاسن وخصوصیات کا صحیح اندازہ تو اس کے مطالعہ کے بعد ہی لگایا جا سکتا ہے، تاہم کتاب کے مقام و مرتبے کے حوالے سے مذکورہ بالا خصوصیات کی روشنی میں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ کتاب فن حدیث کے نادر نکات اور بیش بہا تحقیقات کا خزانہ ہے اور طالبان حدیث کے لیے ایک قیمتی تحفہ اور ارمغان کی حیثیت رکھتی ہے۔

علمی حیثیت: زجاجۃ المصابیح جہاں ایک طرف منتخب حدیثوں کا بہترین مجموعہ ہے، وہاں دوسری طرف حنفی مسلک کی حدیثی خدمات کے زریں سلسلے کی اہم کڑی بھی ہے، جس سے وہ تمام خدشات دور ہو جاتے ہیں جو مسلک حنفی کے بارے میں مخالفین کی طرف سے کیے جاتے ہیں۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ کی طرف منسوب یہ مسلک محض رائے اور قیاس پر مبنی نہیں، بلکہ کتاب وسنت کے عین موافق ہے، نیز معلوم ہوتا ہے کہ فقہ حنفی کے اقوال وفتاوی میں سے کوئی قول اور فتویٰ بے سند نہیں ہے، بلکہ ہر ایک کا کوئی نہ کوئی مستند ومعتبر مآخذ کتاب و سنت کے نصوص کی صورت میں یا صحابہ وتابعین کے آثار و فتاویٰ کی شکل میں ضرور موجود ہے۔ کتاب کی اسی افادیت کی بنا پر، نیز مسلک حنفی کی اپنی نوعیت اور انداز کی پہلی خدمت اور کاوش کی وجہ سے اسے ملک و بیرون ملک کے حنفی حلقوں میں

غیر معمولی مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا بالخصوص علمی حلقوں کی جانب سے اس خدمت کو زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا اور اس کے تئیں قدر دانی کے جذبات ظاہر کیے گئے، چنانچہ اردو کے صاحب طرز ادیب مولانا عبد الماجد دریا بادیؒ (ت ۱۳۹۷) نے اپنے رسالے ''صدق جدید'' لکھنؤ میں کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: ''فاضل مؤلف نے ایک اہم دینی خدمت انجام دی ہے اور حنفیہ کے ذمے جو قرض صدیوں سے چلا آرہا تھا، اسے ادا کرنے کی سعادت انہیں حاصل ہوگئی ہے''۔ مولانا محمد منظور نعمانی (ت ۱۴۱۷ھ) نے اپنے رسالے ماہنامے ''الفرقان'' میں لکھا۔ ''علم حدیث کی خدمت کے عالیشان محل میں ایک اینٹ کی جگہ خالی رہ گئی تھی، شیخ عبد اللہ (مؤلف زجاجۃ) نے اس تالیف کے ذریعہ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچادیا'' شیخ عبد الفتاح ابوغدہؒ نے فرمایا: ''حضرت والا کی تصنیف (زجاجۃ المصابیح) کی جلد اول دستیاب ہوئی، جس نے میری بصیرت کو روشن کردیا، اللہ تعالیٰ آپ کو اس کار خیر پر اسلام اور حضرات احناف کی جانب سے جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین'' حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ نے کتاب پر اپنی تقریظ میں فرمایا: ''زجاجۃ المصابیح اپنے موضوع کی خوبی کے ساتھ ساتھ اپنی نسبت کے لحاظ سے بھی قابل قدر اور لائق استفادہ ہے۔ کیا اچھا ہو کہ مدارس دینیہ میں ''مشکوۃ المصابیح'' کے ساتھ ساتھ یا اس کی جگہ زجاجۃ المصابیح بھی رائج ہوجائے، تاکہ طلبہ کے سامنے مذہب حنفی کے حدیثی مسلک ہونے کی شہادتیں نفس کتاب ونصاب سے بھی مہیا ہوسکیں''۔

ان کے علاوہ دیگر علماء نے بھی اس قیمتی کتاب کے تعلق سے اپنے گراں قدر تأثرات کا اظہار کیا ہے اور اس کی ظاہری ومعنوی خوبیوں کو اجاگر کرتے ہوئے اسے وقت کی اہم ضرورت کی تکمیل اور احناف کی خدمات حدیث کے باب میں ایک قابل قدر اضافہ قرار دیا ہے۔

حرف آخر: زیر نظر تحریر میں علم حدیث کے بحر ناپیدا کنار کے ایک گوہر نایاب اور درّ بے مثال کا تعارف پیش کرنے اور اس کے ظاہری ومعنوی محاسن کو اجاگر کرنے کی ایک طالب علمانہ کوشش کی گئی ہے، جس کا مقصد اس گنج گراں مایہ سے اخذ و استفادہ اور اس کے خصوصیات و امتیازات سے فیضیاب ہونے کی راہ ہموار کرنا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زجاجۃ المصابیح کی چار ضخیم جلدیں احادیث رسول کے ایک مستند و معتبر ذخیرہ اور فقہ حنفی کے مستدلات کے لیے ایک انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہیں، اور جس طرح مشکاۃ المصابیح حضرات شوافع کے یہاں اپنا ایک علمی مقام رکھتی ہے اسی طرح حضرات احناف کے نزدیک بھی زجاجۃ المصابیح ایک گراں قدر سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کتاب کا اس کے شایان شان استقبال کیا جائے اور اس کے پڑھنے پڑھانے کی شکلیں پیدا کر کے مستفدین کے دائرہ کو وسیع کیا جائے، بالخصوص علم حدیث کے طالب علم اور اس کے خوشہ چینوں کو اس کتاب کی طرف متوجہ ہونا چاہیے کہ یہ ان کے لئے کسی قیمتی سوغات سے کم نہیں، ساتھ ہی ارباب مدارس کو حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ کی مذکورہ بالا رائے پر غور وفکر کر کے اس کتاب کو داخل درس کرنے کی طرف قدم بڑھانا چاہیے، اگر ایسا ہوگا تو یقیناً یہ علم حدیث بالخصوص حدیث کے حوالے سے فقہ حنفی کی ایک بڑی خدمت ثابت ہوگی، اور اس کے فوائد وثمرات دیر تک محسوس کیے جاتے رہیں گے۔

☆☆☆

❑ آدابِ زندگی

''میں یہاں سے گزر رہا تھا''

(زندگی کے بعض ضروری آداب)

جاوید چودھری، پاکستان

میرے ایک تیس سال پرانے دوست ہیں' پڑھے لکھے اور دانش ور ہیں' ملک سے باہر رہتے ہیں لہٰذا ملاقاتیں نہ ہونے کے برابر ہیں' فون پر بھی بہت کم بات ہوتی ہے' دو دن پہلے ان کا آڈیو پیغام آیا ''میرا بھائی ملتان سے اپنے کسی دوست کو آم بھجوا رہا ہے' میں نے سوچا میں اسے کہہ دوں وہ تمہیں بھی بھجوا دے' کیا تم بس اڈے سے لے لوگے اور یہ بھی بتاؤ کیا تم آم کھاتے بھی ہو یا پھر نہیں''۔

میں پیغام سن کر ہنس پڑا اور مجھے وہ لطیفہ یاد آ گیا جس میں میزبان نے مہمان سے کہا تھا' آپ کھانا نوش فرمایئے ہم نے ویسے بھی ڈسٹ بین میں ہی پھینکنا تھا' میں نے ان کو جوابی پیغام بھجوایا:

جناب آپ کا بہت شکریہ' آپ نے مجھے اس قابل سمجھا' میں آم نہیں کھاتا لہٰذا آپ ہرگز تکلیف نہ کریں' دوسرے اسلام آباد سے ہر چیز مل جاتی ہے تاہم میں آپ کو صرف سمجھانے کے لیے عرض کرنا چاہتا ہوں تحفہ ایک نفیس چیز ہوتی ہے' اس کے بھی آداب ہوتے ہیں' آپ جب کسی کو کہتے ہیں میرا بھائی کسی کو بھجوا رہا تھا تو میں نے سوچا میں آپ کو بھی بھجوا دوں یا آپ فلاں جگہ جا کر اپنا تحفہ وصول کر لیں گے یا آپ یہ کھاتے بھی ہیں یا نہیں تو یہ دوسرے کی بے عزتی ہوتی ہے، اس کا مطلب ہوتا ہے آپ دوسرے کو کم تر سمجھ رہے ہیں، تحفے عزت افزائی ہوتے ہیں ان میں دوسروں کی عزت نفس کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ میرے دوست مائینڈ کر گئے' ان کا خیال تھا میں ان کے خلوص۔ ان کی محبت کو نہیں سمجھ سکا چناں چہ انہوں نے میرے ساتھ قطع تعلق کا اعلان کر دیا۔

میں اس کے بعد دیر تک افسوس کرتا رہا' میرا خیال تھا مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا' چپ چاپ سہہ جانا چاہیے تھا، لیکن پھر سوچا اگر سب لوگ ایسی غلطیوں پر خاموش رہیں گے' تعلقات بچانے کی فکر کرتے رہیں گے تو پھر ہم اپنی اصلاح کیسے کریں گے؟ آپ اس مثال ہی کو لے لیجیے' میرے دوست یہ بھی کہہ سکتے تھے آپ اپنا ایڈریس دے دیجیے میں آپ کو آم بھجوانا چاہتا ہوں۔

یہ ایک باعزت طریقہ ہوتا' تین جوتے مارنے کی کیا ضرورت تھی، لیکن سوال یہ ہے کیا یہ غلطی صرف میرے اس دوست نے کی؟ جی نہیں! ہم میں سے زیادہ تر لوگ عموماً ایسی ''چول'' مار دیتے ہیں' میں خود بھی ایسی غلطیاں کرتا تھا اور میرے سینئر میری اصلاح کرتے تھے' مثلاً میں 1996ء میں لالہ موسیٰ سے اسلام آباد آ رہا تھا۔

میں نے نئی نئی مہران گاڑی خریدی تھی اور خود کو ٹاٹا اور برلا سمجھتا تھا' چودھری فضل حسین میرے استاد تھے' یہ زمین دار کالج گجرات کے پرنسپل رہے تھے' ان کے شاگرد پوری دنیا میں پھیلے ہوئے تھے اور میں نے زندگی میں ان سے زیادہ نفیس اور شان دار شخص نہیں دیکھا' وہ سرتاپا حس مزاح بھی تھے۔

ان کی ہر بات پھلجھڑی ہوتی تھی' وہ کالج میں روز صبح اسمبلی کے وقت چھوٹی سی تقریر کرتے تھے' پورا کالج اور گردونواح کے لوگ ان کی تقریر سننے صبح آٹھ بجے کالج پہنچ جاتے تھے اور پیٹ پکڑ کر لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے' چودھری صاحب جہلم میں رہتے تھے' وہ کسی فنکشن کے لیے لالہ موسیٰ آئے ہوئے تھے۔

میں نے انہیں راستے میں ڈراپ کی پیش کش کر دی' چودھری صاحب خوش دلی سے میرے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے' وہ گاڑی میں سوار ہونے لگے تو میں نے شوخی میں آ کر نیچ حرکت کر دی' میں نے ہنس کر کہا ''سر آپ کہاں بس پر خوار ہوں گے' میں جہلم سے گزر کر جا رہا ہوں' میں آپ کو راستے میں چھوڑ دوں گا''۔

چودھری صاحب نفیس اور شان دار انسان تھے' وہ مسکرا کر بولے ''بیٹا میں پوری زندگی بسوں پر خوار ہوا ہوں' میں آج بھی خوار ہو سکتا ہوں، لیکن میں نے سوچا' میں ایک گھنٹہ آپ جیسے پڑھے لکھے نوجوان کی کمپنی سے لطف لے لیتا ہوں'' میری کمر تک پسینے میں تر ہو گئی' مجھے آج بھی جب یہ واقعہ یاد آتا ہے تو میں شرمندہ ہو جاتا ہوں۔

لیکن وہ دن ہے اور آج کا دن میں نے زندگی میں جب بھی کسی کو لفٹ دی یا کسی کے لیے گاڑی بھجوائی تو ہمیشہ عاجزی سے عرض کیا' سر آپ اگر میرے ساتھ جائیں گے تو یہ میری عزت افزائی ہو گی' مجھے آپ سے سیکھنے کا موقع ملے گا یا پھر سر میرا ڈرائیور وہ جگہ اچھی طرح جانتا ہے' یہ آپ کو آسانی سے لے جائے گا یا لے آئے گا' اس سے آپ کا بہت سا وقت بچ جائے گا۔

ہم میں سے اکثر لوگ یہ غلطی بھی کرتے ہیں' یہ کسی کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں ''میں ادھر سے گزر رہا تھا میں نے سوچا آپ سے بھی مل لوں'' آپ ذرا فقرے کے اندر جھانک کر دیکھیے یعنی یہ بڑے آدمی ہیں' انہوں نے یہاں سے گزر کر اور آپ کے دفتر یا گھر تشریف لا کر بہت احسان فرمایا اور دوسرا یہ آپ کو اتنا فارغ اور فضول سمجھ رہے ہیں یہ آپ کے پاس جب چاہیں آ جائیں اور آپ پر فرض ہے آپ دروازے اور باہیں کھول کر کھڑے ہو جائیں۔

آپ کوشش کریں یہ غلطی نہ کریں' یہ سیدھی سادی چول ہے، آپ اگر کسی سے ویسے ہی گزرتے گزرتے ملنا چاہتے ہیں تو بھی فون کریں اور یہ کہیں میں اگر ابھی آپ کے پاس آ جاؤں تو کیا آپ سے ملاقات ہو سکتی ہے اور وہ اگر اجازت دیں تو آپ مل لیں ورنہ کسی دوسرے دن خصوصی طور پر ان سے ملنے کے لیے چلے جائیں یوں ہی چلتے چلتے یا گزرتے گزرتے کسی سے ملنا زیادتی ہے۔

ہم میں سے بے شمار لوگ کسی کو کپڑے یا جوتے دیتے ہوئے بھی فرما دیتے ہیں میں نے یہ سوٹ' یہ شرٹ یا پتلون خریدی تھی لیکن یہ تنگ یا ڈھیلی نکلی' میں نے سوچا یہ میں آپ کو دے دوں یا نیا جوتا نکالیں گے اور کہیں گے یہ میں نے لندن سے خریدا تھا' یہ مجھے تنگ ہے' یہ آپ لے لیں۔ یہ بھی دوسرے شخص کی سیدھی سادی بے عزتی ہے۔

آپ اس کے بجائے وہ کپڑے یا جوتے پیک کرا کر اپنے کسی ورکر یا کسی ضرورت مند کو دے دیں' آپ کو ثواب بھی ملے گا اور دل کو تسلی بھی ہو گی اور آپ نے اگر واقعی غلط سائز کے جوتے یا کپڑے خرید لیے ہیں اور آپ نے یہ استعمال نہیں کیے اور یہ آپ اپنے کسی دوست ہی کو دینا چاہتے

ہیں تو آپ اسے ''ری پیک'' کرائیں اور اپنے دوست یا عزیز رشتے دار کو دے دیں۔

وہ خوش ہو جائے گا، یہ چول مارنے کی کیا ضرورت ہے یہ مجھے تنگ یا ڈھیلا تھا لہٰذا تم لے لو اس رویے سے آپ کی چیز بھی ضائع ہو جاتی ہے اور دوسرے کا دل بھی ٹوٹ جاتا ہ، میرے سامنے ایک بار میرے ایک جاننے والے نے اپنے ایک دوست کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا' اس نے اسے ''رسل اینڈ براملے'' کا نیا جوتا دیا اور کہا یہ میں نے لندن سے پانچ سو پاؤنڈ کا خریدا تھا۔ یہ مجھے تنگ ہے' میں نے ایک دن بھی نہیں پہنا' یہ تمہیں آ جائے گا' تم لے لو' یہ سن کر سامنے موجود شخص کا چہرہ سرخ ہو گیا' اس نے جوتا لیا' اپنا ڈرائیور بلایا اور اسے جوتے دے کر بولا ''بیٹا یہ نوید صاحب آپ کے لیے لندن سے لائے ہیں' آپ انہیں پہن کر دکھاؤ'' ڈرائیور خوش ہو گیا' اس نے اپنے میلے جوتے اتارے' نیا جوتا پہنا' چل پھر کر تسلی کی اور جھک کر نوید صاحب کو سلام پیش کیا۔ نوید صاحب کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا۔ اور ایک جا رہا تھا۔

ہم پنجابی قیمت پوچھنے کی علت کا شکار بھی ہیں' ہمیں اگر کسی کی شرٹ' کرسی' میز' گھڑیا گاڑی پسند آ جائے گی تو ہم اس سے فوراً اس کی قیمت پوچھ لیں گے' ہم اس سے گھڑیا فلیٹ کا رقبہ بھی پوچھیں گے مثلاً یہ کتنے مرلے میں ہے' بنانے میں کتنا ٹائم لگا اور کتنا خرچ ہوا؟ اور یہ شرٹ کہاں سے لی اور کتنے میں لی' یہ بھی دوسرے کی بے عزتی ہوتی ہے۔

آپ کو اگر کسی کے کپڑے اچھے لگ رہے ہیں تو آپ کھل کر ان کی تعریف کریں' وہ اگر مناسب سمجھے گا تو وہ آپ کو درزی یا برینڈ کا نام بتا دے گا' آپ وہ یاد رکھ لیں اور واپس جا کر درزی یا دکان دار سے تفصیل پوچھ لیں۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو آپ کھل کر تعریف کریں' گھر جائیں' وہاں سے فون کریں اور اس سے برینڈ یا درزی کے بارے میں پوچھ لیں لیکن قیمت اس وقت بھی نہ پوچھیں۔

کیوں؟ کیوں کہ قیمت پوچھنے کا مطلب ہوتا ہے آپ چیزوں کو جمالیاتی حس کی بجائے بیوپاری یا قصائی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور آپ کی نظر میں چیز کی نہیں، قیمت کی ویلیو ہے اور یہ حرکت ناشائستہ بھی ہے اور چیپ بھی۔

میں ایک بار روم میں کسی کا مہمان تھا' میرا میزبان شان دار کلچرڈ انسان تھا' میں اس کی شرٹ کا عاشق ہو گیا۔ میں نے جی بھر کر اس کی تعریف کی' وہ خوش ہو گیا' کھانے کے دوران اس نے میری فضول سی شرٹ کی تعریف کی اور باتوں ہی باتوں میں پوچھا' مجھے اس کا کالر 40 لگ رہا ہے' میں نے فوراً جواب دیا نہیں یہ 41 ہے اور یہ قطعاً اچھی نہیں' اس نے کہا' مجھے تو یہ بہت اچھی لگ رہی ہے' ہم نے کھانا کھایا' میں ہوٹل واپس آ گیا۔ اگلی شام میرے میزبان کا ڈرائیور آیا اور مجھے اس کی طرف سے ایک گفٹ پیک دے گیا' میں نے کھولا تو وہ اسی طرح کی شرٹ تھی جیسی اس نے رات پہن رکھی تھی' میں خوش ہو گیا' میں نے اگلے دن اس کو دو برینڈ ڈ ٹائیاں بھجوا دیں' وہ بھی خوش ہو گیا جب کہ میں زمانہ جاہلیت میں کیا کیا کرتا تھا؟ میں فوراً چیز کی قیمت اور دکان پوچھ لیتا تھا اور دوسرے بے چارے کا منہ بن جاتا تھا۔

یہ یاد رکھیں تحفہ سنت ہے' یہ ایک مقدس اور نفیس چیز ہوتا ہے لہٰذا ہمیں چاہیے ہم جب کسی کو تحفہ دیں تو سنت سمجھ کر' عبادت سمجھ کر دیں' عزت اور احترام کے ساتھ دیں' اسے خیرات نہ بنا دیں' اس سے دوسروں کے دل ٹوٹ جاتے ہیں۔

☆☆☆

❑ شخصیات

حیدرآباد کی عظیم شخصیت مولانا نصیرالدینؒ

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

مرد سپاہی تھا وہ اس کی زرہ لا الہ
سایہ شمشیر میں اس کی پنہ لا الہ

یہ دنیا سرائے فانی ہے یہاں جو آتا ہے وہ جانے کے لئے ہی آتا ہے لیکن حیدرآباد کے مولانا نصیرالدین کا انتقال ایسا خلا ہے جسے آسانی سے پر نہیں کیا جاسکتا ہے، درسگاہ جہاد وشہادت کے حوالہ سے، وحدت اسلامی کی تنظیم کے حوالہ سے، جامعۃ البنات کے حوالہ سے، مسلمانوں کے احتجاجات کے حوالہ سے، ملت کے معاملات میں حق گوئی وبیبا کی کے حوالہ سے ان کی شخصیت ہمیشہ یادرکھی جائے۔ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کی گئی اور کشمیریوں کی آزادی سلب کی گئی دفعہ ۳۷۰ ختم کی گئی ہر جمہوریت پسند نے اس اقدام کو ناپسند کیا لیکن مولانا نصیرالدین نے باقاعدہ احتجاج کیا اور خود کو گرفتاری کے لئے پیش کیا ۔پولیس نے ان کو حراست میں لے لیا۔مولانا نے اپنی تقریر میں کہا تھا حکومت کا فیصلہ ہندوستان کی تاریخ کا روز سیاہ ہے ۔ایک مولانا نصیر الدین نہیں ہندوستان کے لاکھوں ہندو مسلمان حکومت کی کاروائی سے مطمئن نہیں تھے ۔اس برائی کو برا سمجھنے والوں کی تعداد بہت تھی لیکن آگے بڑھ کر احتجاج کر کے روکنے کی کوشش ہر شخص نے نہیں کی ۔جرأت ہمت شجاعت سے کام لینے، ظالم کا گریبان پکڑنے کی کوشش بہت کم لوگ کرتے ہیں۔بہت کم لوگ ہیں جو اس کے بارے میں سوچتے بھی ہیں۔اکثریت نہیں غالب اکثریت عہدہ ومنصب والوں میں ایسے ہی لوگوں کی ہوتی ہے جنہیں روٹی کپڑے مکان کے سوا کسی چیز کی فکر نہیں ہوتی ہے۔وہ ملت کے کسی کام کے نہیں ہوتے ہیں بلکہ وہ دوسروں کو بھی ملی کاموں میں حصہ لینے سے ڈراتے ہیں۔ مسلمانوں کی عددی اکثریت ایسے ہی مردہ قسم کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ہم لوگ درحقیقت مردہ خانہ میں زندگی گذارتے ہیں، لاشوں کے درمیان۔بے جان انسانوں کے درمیان۔ مرکزی حکومت نے جب مسلمانون کے خلاف سی اے اے اور ان آر سی کے قوانین پاس کئے تو اس شہریت ترمیمی ایکٹ کے خلاف پورے ملک میں احتجاجات ہوئے، حیدرآباد میں یہ احتجاج آل پارٹی ملین مارچ کا احتجاج تھا، کئی کیلومیٹر کا جلوس، اس احتجاج کے قائدین میں مولانا نصیرالدین صاحب کی شخصیت بہت نمایاں تھی جنہوں انسانوں کے جم غفیر کے سامنے

حکومت کی غیر منصفانہ پالیسی پر پرجوش تقریر کی تھی ، ان کی تقریر میں علم کی روشنی اور جذبہ کی فراوانی اور مرد مومن کی غیرت ایمانی موجود تھی۔

ہر سال فلسطین کا مسئلہ اور بیت المقدس کا مسئلہ سامنے آتا ہے یہ مسئلہ ہر مسلمان کے دل کا داغ اور سینہ کا چراغ ہے ،اسرائیل کی جارحیت کے خلاف تقریریں ہوتی ہیں۔ مولانا نصیر الدین بہت اہتمام کے ساتھ اس دن احتجاجی جلسے ہر سال منعقد کرتے تھے اور مسلمانوں کے ضمیر کو زندہ اور بیدار رکھنے کی کوشش کرتے تھے تاکہ لوگ مسئلہ فلسطین کو بھول نہ جائیں اور داغ ہائے سینہ تازہ رہیں۔ کسے معلوم تھا کہ عرب کی حکومتیں بھی بیت المقدس کو بھول جائیں گی اور سعودی عرب کے فرمانروا کے اسرائیل سے تعلقات قائم ہوجائیں گے اور علماء دین پر بھی مرگ سکوت طاری ہوجائے گا اور وہ عرب حکومتوں پر تنقید بھی نہیں کرسکیں گے۔ان کی زبانوں پر تالے اور منہ میں چھالے پڑجائیں گے۔افسوس ''قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں''۔

طلاق ثلاثہ کے مسئلہ پر حکومت نے جب مسلم مخالف رویہ اختیار کیا تو حکومت کی ناانصافی کے خلاف مولانا نصیر الدین حق کی آواز بن گئے اور انہوں نے حکومت کی اسلام دشمنی کے خلاف مسلسل تقریریں کیں اور قوم کے ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ روہنگیا کے مسلمانوں پر جب ظلم کے پہاڑ توڑے گئے تو یہ مولانا نصیر الدین تھے جنہوں نے حیدرابا د میں جلسوں اور جلوسوں کا پروگرام منعقد کیا اور مظلوم مسلمانوں سے یک جہتی کا اظہار کیا۔ظلم کے پہاڑ تو ٹوٹتے رہیں گے اور ابھی آثار نہیں ہیں کہ یہ سلسلہ رک جائے گا لیکن مولانا نصیر الدین ہمارے درمیان باطل سے پنجہ آزمائی کے لئے نہیں ہوں گے اور ایسے ہر موقعہ پر ان کی یاد آئے گی اور دلوں کو تڑپائے گی۔مولانا نصیر الدین کا انتقال ایک شخص کا انتقال نہیں ہے،مسلمانوں کے سواد اعظم کا ایک عظیم قائد سے محروم ہونا ہے۔

مولانا نصیر الدین حقیقی معنی میں ایک زندہ انسان تھے اور ایک زندہ انسان کی خصوصیات رکھتے تھے،غریبوں کی مدد اور دستگیری ، محتاجوں کی حاجت روائی ، مشکلات میں گھرے ہوئے خاندانوں کی مشکل کشائی ، بادوستاں تلطف ، نرم دم گفتگو گرم دم جستجو ، اسلام مخالف طاقتوں کے لئے فولاد ، زبان سے ہمیشہ حرف حق کہنے والے ، کسی سے نہ ڈرنے والے۔ ابھی کچھ پہلے کسی اخبار میں خبر پڑھی تھی کسی چڑیا گھر میں ایک شیر کی موت ہوگئی، آج ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ انسانوں کے چڑیا گھر میں ایک ببر شیر فوت ہوگیا،اب کون بلند آہنگی سے حق کا آوازہ بلند کرے گا۔جس کی صوت جس کی سطوت جس کی صولت سے بزم کافری تھرا جائے گی۔

مولانا نصیر الدین صاحب کی ان کی حق گوئی ، بیباکی اور ان کی قربانیوں کی وجہ سے میرے دل میں بڑی عزت تھی۔ وہ اکثر وبیشتر اس عاجز کے گھر بھی تشریف لاتے اور میری عزت افزائی فرماتے۔ اپنے ساتھ'' وحدت'' کے شمارے بھی لاتے جس میں اس کوتاہ قلم کے مضامین بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ پاکستان کے ترجمان القرآن کے شمارے بھی لاکر دیا کرتے تھے۔حالات حاضرہ پر اور مسلمانوں کے مسائل پر ان سے گفتگو ہوا کرتی تھی۔ وحدت اسلامی کی تنظیم کے کئی اجتماعات میں جو مختلف شہروں میں منعقد ہوتے تھے انہوں نے شریک ہونے کی دعوت دی اور مجھ سے تقریریں کروائیں بلکہ شروع شروع میں تو انہوں نے وحدت کی تنظیم میں آندھرا

پردیش کی نظامت کی دعوت بھی دے ڈالی، میں نے معذرت کرلی اور کہا کہ میں تو ابھی تک صرف قرطاس وقلم کی بساط سجا کر لکھنے پڑھنے کا کام کرتا آیا ہوں، عملی میدان میں اترنا بہت مشکل ہے اور پھر میں نے کہا کہ میر تقی میر کا شعر بالکل میرے حسب حال ہے ۔

ہوگا کسی دیوار کے سایہ کے تلے میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

مولانا نصیرالدین صاحب کا مجھ پر بہت لطف وکرم تھا اور میری بہت عزت افزائی کرتے تھے میری ہر تحریر کو جو منصف اخبار میں شائع ہوتی تھی نہ صرف خود پڑھتے تھے بلکہ وحدت اسلامی کی تنظیم کے ہر ہفتہ کے اجتماع میں اس کو سنانے کا اہتمام کرتے تھے میری بہت سی باتوں سے اتفاق کرتے تھے۔ وہ تحریک مزاحمت کے قائد تھے۔ ان کی ساری انرجی اسی مزاحمت اور کشمکش میں صرف ہوتی تھی، بلاشبہہ ظلم کے آگے سر نہ جھکانا بہت بڑی اسلامی قدر ہے۔ میں نے اپنے خیالات سے انہیں ادب واحترام کے ساتھ آگاہ کیا تھا۔ میں نے عرض کیا تھا مزاحمت ضروری کام ہے ظلم کے سامنے سر نہیں جھکانا چاہئے، لیکن یہ مسئلہ کا اصل حل نہیں ہے۔ جو اصل راستہ ہے جس میں مسئلہ کا حل چھپا ہوا ہے وہ مسلمانوں نے صدیوں سے چھوڑ رکھا ہے۔ تمام انبیاء کرام تمام بنی نوع انسان کو حق کی دعوت دیتے تھے اور جو حق کی دعوت قبول کرلیتے تھے ان کی تربیت فرماتے تھے اب مسلمان یہ کرتے ہیں کہ صدیوں پہلے جو حق کی دعوت قبول کرچکے ہیں صرف ان ہی کے درمیان کام کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی اصلاح وتربیت کا کام بھی اہم ہے لیکن صرف ان کے درمیان کام کرنا انبیاء کا طریقہ نہیں ہے۔ یہ طریقہ وہاں تو قابل قبول ہے جہاں صرف مسلمان بستے ہوں لیکن غیر مسلموں کی اکثریت کے درمیان رہ کر صرف مسلمانوں کے درمیان کام کرنا غیر انبیائی طریقہ ہے۔ مسلمانوں نے مدتوں سے انبیاء کرام کے طریقہ کو چھوڑ رکھا ہے گاڑی پٹری سے اتر گئی ہے۔ ڈیریلمنٹ ہو گیا ہے۔ لاکھوں لوگ جہنم کے شعلوں کی لپیٹ میں آسکتے ہیں۔ لاکھوں اور کروروں لوگ زبان حال سے کہہ رہے ہیں ماجائنا من نذیر ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا آیا ہی نہیں۔ جہاد وشہادت تو مؤمن کے شوق کی معراج ہے لیکن اس سے پہلے ابلاغ اور تفہیم کا پورا حق ادا کرنا ضروری ہے ۔ حیدراباد کے حضرت شاہ جمال الرحمٰن صاحب نے ایک بار اپنی مجلس میں فرمایا تھا کہ ایک شخص کے تین بیٹے ہوں ایک صحتمند ہو اور دو بیمار ہوں تو کیا ایک باپ کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ وہ اپنے دو بیمار بیٹوں کی فکر نہ کرے۔ بیمار بیٹوں کے علاج کی بھی فکر کرنا صحیح نقطہ نظر ہے۔ لیکن مسلمانوں کی چھوٹی بڑی تمام تنظیمیں صرف ایک صحتمند بیٹے کی فکر میں مبتلا ہیں۔ اور دو بیمار بیٹوں سے لاپرواہ ہیں۔ برادران وطن تک توحید کا پیغام پہونچانے کے بہت سے طریقے ہوسکتے ہیں۔ ایک طریقہ وہ تھا جو صوفیہ کرام نے اس ملک میں اختیار کیا تھا۔ ہر بستی اور ہر شہر میں ایک دو شخص ہوا کرتے تھے جو غیر مسلموں کی عقیدت اور محبت کا مرکز بن جایا کرتے تھے۔ بہت سے غیر مسلم ان کے ہاتھ پر اسلام بھی قبول کرلیتے تھے۔

میں نے مولانا نصیرالدین صاحب سے عرض کیا تھا کہ ظلم کا مقابلہ اور مزاحمت اور اس راہ میں قربانی دینا قابل ستائش قدر ہے اور اس کی ضرورت بھی ہے لیکن صرف اس سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ فارسی کے ایک شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اے اعرابی تو کعبہ جانا چاہتا ہے لیکن یہ راہ جو تو نے اختیار

کی ہے وہ تو ترکستان جانے والی ہے۔''این راہ کہ تو می روی بترکستان است''یعنی اس راستہ چلنے سے تمہارا مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ ہماری ملت اسلامیہ کے تمام قائدین ملت کو کعبہ کی طرف لے جانا چاہتے ہیں لیکن غلطی سے راستہ ترکستان کا اختیار کر لیتے ہیں۔

راقم سطور نے اپنے نقطہ نظر کو کئی بار بیان کیا ہے میں نے لکھا ہے کہ اللہ تعالی نے مسلمانوں کو خیر امت کا لقب عطا فرمایا تھا اس لئے کہ ان کا فرض منصبی ''اخرجت للناس'' تھا یعنی تمام بنی نوع انسان کو مخاطب بنانا،لیکن مسلمانوں نے ہمیشہ(شروع کی چند صدیوں کو چھوڑ کر) صرف مسلمانوں کو اپنا مخاطب بنایا اور پھر آہستہ آہستہ ان کا پورا نقطہ نظر تبدیل ہوکر رہ گیا۔تمام رسول قوم کو جیسا کہ قرآن میں ہے لسان قوم میں دعوت دیتے آئے تھے،لیکن نقطہ نظر کی تبدیلی کی وجہ سے ہندوستان میں گذشتہ دوسوس برس میں علماء نے جتنے مدارس قائم کئے وہ صرف مسلمانوں میں کام کرنے والے اور لسان المسلمین میں کلام کرنے والے علماء تیار کرنے کے لئے تھے اور آج تک مسلمانوں کو اپنی غلطیوں کا شعور نہیں ہے اور لسان قوم کی فکر نہیں ہے۔مسلمان بتدریج کعبہ کی راہ سے دور اور ترکستان سے قریب ہوتے جارہے ہیں۔راقم سطور نے تبلیغی جماعت کے امیر مولانا سعد صاحب سے نظام الدین میں مل کر یہ تجویز پیش کی تھی کہ تبلیغی جماعت کے چھ اصول ہیں ان میں ایک اکرام مسلم بھی ہے اسی کے ساتھ خدمت خلق اور خدمت انسانیت کی ایک شق بھی شامل کر لی جائے تاکہ برادران وطن سے بھی ''الخلق عیال اللہ'' کے تحت کسی قدر تبلیغی کام کرنے والوں کا رابطہ ہو اور ان کو مانوس کرنے کی کوشش کی جائے لیکن کیا کیا جائے کہ ہمارے صالحین اور قائدین سب کو متفقہ طور ''ترکستان'' جانے پر اصرار ہے چاہے یہ راستہ ''قبرستان'' سے کیوں نہ گذرتا ہو۔ چاہے اس میں جان اور ایمان سب گنوانا پڑے۔ پرسنل لا سے ہاتھ دھونا پڑے۔اور ناکامی مقدر بن جائے، کیونکہ کسی چیز کے صحیح ہونے کی ان کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ علماء اور خاص طور بقیۃ السلف قسم کے علماء اس کو پیش کرتے ہوں۔اگر وہ یہ بات نہیں کہتے ہیں تو کسی پروفیسر، کسی رائٹر کسی تھنکر کے کہنے سے یہ بات کیسے مان لی جائے۔ ۔اسی لئے ہماری بات اگر چہ قرآن کے مطالعہ پر مبنی ہے لیکن نقار خانہ میں طوطی کی آواز ہے اور ایک دور افتادہ صدا۔اور صدا بصحراء۔ایک آوازہ جسے نہ کوئی گوش شنوا میسر آیا، نہ کوئی دیدہ بینا نہ کوئی قلب عبرت پذیر۔

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ملت کی فکر کرنا اور اس کی خبر گیری کرنا خود بہت قابل ستائش بات ہے۔حدیث میں اس کی تاکید ہے،ملت میں فراغت سے زندگی گذارنے والے طبقہ نے زندگی کو پھولوں کی سیج بنا رکھا ہے۔ یہ طبقہ ساحل پر بیٹھ کر طوفانوں کا نظارہ کرتا ہے۔ایسے بے شعور اور دین سے دور طبقہ کی بھی حفاظت اور دستگیری کا ذمہ مولانا نصیر الدین صاحب نے لیا تھا اور انہوں نے بڑی قربانیاں دی تھیں اور ان کے خاندان کے لوگوں نے بھی قربانیاں دی تھیں اللہ تعالی ان کی قربانیوں کا ان کو اجر جزیل اور ان کے گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے منور اور جنت الفردوس کے پھولوں سے معطر کرے آمین۔

☆☆☆

❑ قضیۂ ایاصوفیہ

ایاصوفیہ-اہمیت وتاریخ

ضیاءالرحمٰن چترالی

ترکی کی اعلیٰ عدالت نے متفقہ طور پر دنیا کی تاریخی عمارت آیاصوفیہ(Hagia Sophia Museum) کو دوبارہ بحیثیت مسجد بحال اور 1935 میں اتاترک کا بینہ کا آیا صوفیہ کو میوزیم میں تبدیل کرنے کا فیصلہ منسوخ کردیا۔اردگان نے 24 برس بعد اپنا وعدہ پورا کردیا۔آیاصوفیہ اب سلطان فاتح کے فرمان کے مطابق مسجد ہوگی۔اتاترک نے 1935 میں اسے میوزیم میں تبدیل کیا تھا۔صدراردگان نے اس سے قبل آیاصوفیہ کو مسجد قرار دیتے ہوئے قانونی کارروائی کا اعلان کیا تھا۔ترک عدالت کے فیصلے پر شور مچانے والوں کو دوٹوک جواب دیتے ہوئے صدراردگان نے کہا کہ آیاصوفیہ کی حیثیت پر بیرونی بیان بازی ہماری سالمیت پر حملہ تصور ہوگی۔اس موقع پر اردگان نے استنبول میں ایک اور مسجد کا بھی سنگ بنیاد رکھ دیا (ہمارے جعلی مسلمان حکمران مسجد گرانے اور مندر بنانے میں مصروف ہیں)۔ترک صدر نے کہا ترکی میں مسلم اکثریت آباد ہے، جن کے علاوہ دیگر مذاہب کے پیروکار بھی اپنے عقائد کے مطابق آزادانہ طور پر عبادت گزاری اور تہواروں کو منانے کا حق رکھتے ہیں جن کا تحفظ ہماری ذمے داری ہے۔

تاریخی پس منظر:

ایاصوفیہ، سلطان محمد فاتح کے ہاتھوں فتح قسطنطنیہ ہونے تک مسیحیوں کا دوسرا بڑا مذہبی مرکز بنا رہا ہے، تقریباً پانچویں صدی عیسوی سے مسیحی دنیا دو بڑی سلطنتوں میں تقسیم ہو گئی تھی، ایک سلطنت مشرق میں تھی جس کا پایہ تخت قسطنطنیہ تھا، اور اس میں بلقان، یونان، ایشیائے کوچک، شام، مصر اور حبشہ وغیرہ کے علاقے شامل تھے، اور وہاں کا سب سے بڑا مذہبی پیشوا بطریرک (Patriarch) کہلاتا تھا۔اور دوسری بڑی سلطنت مغرب میں تھی جس کا مرکز روم (اٹلی) تھا۔یورپ کا بیشتر علاقہ اسی کے زیر نگیں تھا، اور یہاں کا مذہبی پیشوا پوپ یا پاپا کہلاتا تھا۔ان دونوں سلطنتوں میں ہمیشہ سیاسی اختلافات کے علاوہ مذہبی اور فرقہ وارانہ اختلافات جاری رہے۔مغربی سلطنت جس کا مرکز روم تھا وہ رومن کیتھولک کلیسا فرقے کی تھی۔اور مشرقی سلطنت، آرتھوڈوکس کلیسا فرقے کی تھی۔ایاصوفیہ کا چرچ یہ آرتھوڈوکس کلیسیا کا عالمی مرکز تھا۔(جہان دیدہ، مفتی تقی عثمانی)

مسیحی اہمیت:

ایاصوفیہ مسیحیوں کے گروہ آرتھوڈوکس کا عالمی مرکز تھا، اس چرچ کا سربراہ جو بطریرک یا ''پیٹریارک'' کہلاتا تھا، اسی میں مقیم تھا، لہذا نصف مسیحی دنیا اس کلیسا کو اپنی مقدس ترین عبادت گاہ سمجھا کرتی تھی۔آیاصوفیہ اس لحاظ سے بھی اہم تھا کہ وہ روم کے کیتھولک کلیسیا کے مقابلے میں زیادہ قدیم تھا۔اس

کی بنیاد تیسری صدی عیسوی میں اسی رومی بادشاہ قسطنطین نے ڈالی تھی جو روم کا پہلا عیسائی بادشاہ تھا اور جس کے نام پر اس شہر کا نام بیزنطیہ سے قسطنطنیہ رکھا گیا تھا۔ تقریباً ایک ہزار سال تک یہ عمارت اور کلیسا پورے عالم عیسائیت کے مذہبی اور روحانی مرکز کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ مسیحیوں کا عقیدہ بن چکا تھا کہ یہ کلیسا کبھی ان کے قبضے سے نہیں نکلے گا۔ اس سے ان کے مذہبی اور قلبی لگاؤ کا یہ عالم ہے کہ اب بھی آرتھوڈوکس کا سربراہ اپنے نام کے ساتھ ''سربراہِ کلیسائے قسطنطنیہ'' (The Hear of the Church of the Constantinople) لکھتا آیا ہے۔ (حوالہ بالا)

تعمیر:

قسطنطین نے اس جگہ 360ء میں ایک لکڑی کا بنا ہوا کلیسا تعمیر کیا تھا۔ چھٹی صدی میں یہ کلیسا جل گیا تو اسی جگہ قیصر جسٹینین اول نے 532ء میں اسے پختہ تعمیر کرنا شروع کیا اور اس کی تعمیر پانچ سال دس مہینے میں مکمل ہوئی۔ دس ہزار معمار اس کی تعمیر میں مصروف رہے اور اس پر دس لاکھ پاؤنڈ خرچ آیا۔ اس کی تعمیر میں قیصر نے دنیا کے متنوع سنگ مرمر استعمال کیے، تعمیر میں دنیا کے خاص مسالے استعمال کیے گئے۔ دنیا بھر کے کلیساؤں نے اس کی تعمیر میں بہت سے نوادر نذرانے کے طور پر پیش کیے۔ اور روایت ہے کہ جب جسٹینین اول اس کی تکمیل کے بعد پہلی بار اس میں داخل ہوا تو اس نے کہا: ''سلیمان میں تم پر سبقت لے گیا''۔ (نبی سلیمان علیہ السلام کے ذریعہ بیت المقدس کی تعمیر پر تکبرانہ اور گستاخانہ جملہ تھا۔ نعوذ باللہ)

اسلامی فتح:

جب 1453ء میں عثمانی سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کو فتح کیا، اور بازنطینیوں کو شکست ہوگئی تو اس شہر کے مذہبی رہنماؤں اور راسخ العقیدہ عیسائیوں نے اسی کلیسا میں اس خیال سے پناہ لے لی تھی کہ کم از کم اس عمارت پر دشمن کا قبضہ نہیں ہو سکے گا۔ مشہور انگریز مؤرخ ایڈورڈ گبن منظر کشی کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''گرجا کی تمام زمینی اور بالائی گیلریاں بابوں، شوہروں، عورتوں، بچوں، پادریوں، راہبوں اور کنواری ننوں کی بھیڑ سے بھر گئی تھی، کلیسا کے دروازوں کے اندر اتنا ہجوم تھا کہ ان میں داخلہ ممکن نہ رہا تھا۔ یہ سب لوگ اس مقدس گنبد کے سائے میں تحفظ تلاش کر رہے تھے جسے وہ زمانہ دراز سے ایک ملأ اعلی کی لاہوتی عمارت سمجھتے آئے تھے۔ یہ سب ایک افترا پرداز الہام کی وجہ سے تھا جس میں یہ جھوٹی بشارت تھی کہ جب ترک دشمن اس ستون (قسطنطین ستون) کے قریب پہنچ جائیں گے تو آسمان سے ایک فرشتہ ہاتھ میں تلوار لیے نازل ہوگا اور اس آسمانی ہتھیار کے ذریعے سلطنت ایک ایسے غریب آدمی کے حوالے کر دے گا جو اس وقت اس ستون کے پاس بیٹھا ہوگا۔ (The Decline and Fall of the Roman Empire. 697, 696")

لیکن ترک عثمانی فوج اس ستون سے بھی آگے بڑھ کر صوفیہ کلیسا کے دروازے تک پہنچ گئے، نہ کوئی فرشتہ آسمان سے نازل ہوا اور نہ رومیوں کی شکست فتح میں تبدیل ہوئی۔ کلیسا میں جمع عیسائیوں کا ہجوم آخر وقت تک کسی غیبی امداد کا منتظر رہا۔ بالآخر سلطان محمد فاتح اندر داخل ہو گئے، اور سب کے جان مال اور مذہبی آزادی کی ضمانت دی۔

فتح کے دن فجر کی نماز کے بعد سلطان محمد فاتح نے یہ اعلان کیا تھا کہ ''ان شاء اللہ ہم ظہر کی نماز ایا صوفیہ میں ادا کریں گے''۔ چنانچہ اسی دن قسطنطنیہ فتح ہوا اور اس سرزمین پر پہلی نماز ظہر ادا کی گئی، اس کے بعد پہلا جمعہ بھی اسی میں پڑھا گیا۔

آیا صوفیہ مسجد:

قسطنطنیہ چونکہ سلطان کی طرف سے صلح کی پیشکش کے بعد بزور شمشیر فتح ہوا تھا، اس لیے مسلمان ان کلیساؤں کو باقی رکھنے کے پابند نہ تھے اور اس بڑے چرچ کے ساتھ جو توہمات اور باطل عقیدے وابستہ تھے انھیں بھی ختم کرنا تھا۔ اس لیے سلطان محمد فاتح نے اس چرچ کو مسجد میں تبدیل کرنے کا ارادہ کیا، چنانچہ اسے مال کے ذریعہ خریدا گیا، اس میں موجود رسموں اور تصاویر کو مٹا دیا گیا یا چھپا دیا گیا اور محراب قبلہ رخ کر دی گئی، سلطان نے اس کے میناروں میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد یہ مسجد "جامع آیا صوفیہ" کے نام سے مشہور ہوگئی اور سلطنت عثمانیہ کے خاتمہ تک تقریباً پانچ سو سال تک پنجوقتہ نماز ہوتی رہی۔

عمارت:

آیا صوفیہ کے سامنے ایک خوبصورت چمن ہے، اس کے بعد اس کا مرکزی دروازہ ہے، دورازے کے دونوں طرف وہ پتھر نصب ہیں جہاں پہرہ دار کھڑے ہوتے تھے۔ اندر وسیع ہال ہے جو مربع شکل کا ہے، اس کی وسعت غلام گردش اور محراب کو چھوڑ کر جنوباً شمالاً 235 فٹ ہے، بیچ کے گنبد کا قطر 107 فٹ اور چھت کی اونچائی 185 فٹ ہے۔ پوری عمارت میں 170 ستون ہیں۔ چاروں کونوں پر مسلمانوں نے چھ ڈھالوں پر اللہ، محمد، ابوبکر، عمر، عثمان اور علی نہایت خوشخط لکھ کر لگایا ہوا ہے۔ اوپر چھت کی طرف بڑے بڑے خوبصورت روشندان بنے ہوئے ہیں۔ عمارت میں سنگ مرمر استعمال کیا گیا ہے، بیشمار تختیاں لگی ہوئی ہیں جن پر عربی خط میں لکھا اور نقش ونگار کیا گیا ہے۔

آیا صوفیہ میوزیم:

آیا صوفیہ کی عمارت فتح قسطنطنیہ کے بعد سے 481 سال تک مسجد اور مسلمانوں کی عبادت گاہ رہی۔ لیکن سلطنت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد جب مصطفیٰ کمال اتاترک ترکی کا سربراہ بنا، تو اس نے اس مسجد میں نماز بند کر کے اسے میوزیم (عجائب گھر، نمائش گاہ) بنا دیا اور کل تک یہ نمائش گاہ تھی اور آج سے دوبارہ مسجد بن گئی۔ الحمدللہ

مسجد بحالی کا مطالبہ:

31 مئی 2014ء کو ترکی کی "نوجوانان اناطولیہ" نامی ایک تنظیم نے مسجد کے میدان میں فجر کی نماز کی مہم چلائی جو آیا صوفیہ کو مسجد بحالی کے مطالبے پر مبنی تھی۔ اس تنظیم کا کہنا تھا کہ انھوں نے ڈیڑھ کروڑ لوگوں کی تائیدی دستخطوں کو جمع کیا ہے۔ لیکن اس وقت کے وزیراعظم کے مشیر نے بیان دیا کہ ابھی ایا صوفیہ کو مسجد میں بحال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ستمبر 2018 میں آئینی عدالت نے ایک غیر جانبدار تاریخی ورثہ ایسوسی ایشن کی جانب سے اس عمارت کو نماز کے لیے کھولنے کی درخواست مسترد کی تھی۔ 1994 میں جب ترک صدر رجب طیب اردگان استنبول کے ناظم کا انتخاب لڑ رہے تھے تو انہوں نے اس عمارت کو نماز کے لیے کھولنے کا وعدہ کیا تھا جبکہ 2018 میں وہ یہاں قرآن کی تلاوت بھی کر چکے ہیں۔ اس کے بعد اسے دوبارہ مسجد بنانے کیلئے قانونی کارروائی شروع کی گئی۔ جس کا فیصلہ جمعرات کو سنایا جانا تھا۔ مگر عدالت نے فیصلہ محفوظ کر دیا تھا۔ جسے کل سنایا گیا۔ واضح رہے کہ آیا صوفیہ دنیا کے چند مشہور سیاحتی مراکز میں سے ہے۔ ہر سال لاکھوں سیاح آیا صوفیہ کو دیکھنے کے آتے ہیں۔ یہ 2019 میں 38 لاکھ سیاحوں کے ساتھ ترکی کا معروف ترین مقام تھا۔ اردگان کا کہنا ہے کہ مسجد بحالی کے بعد اسے سیاحوں کیلئے بلا معاوضہ کھولا جائے گا۔

☆☆☆

❑ قضیۂ ایاصوفیہ

''ایاصوفیہ'' کی بحالی پر اضطراب یا اسلاموفوبیا کا اظہار؟

تحریر: شیخ احمد الریسونی
مترجم: محمد سہیل الندوی

جس وقت سے اس عالیشان و پرشکوہ مسجد (جو ترکی کے شہر استنبول میں ''آیاصوفیہ'' کے نام سے مشہور و معروف ہے) کی بحالی کا فیصلہ ترکی کی عدالت عالیہ نے تمام شواھد وثبوتوں کی بنیاد پر سنایا ہے ٹھیک اسی وقت سے کچھ یورپین ممالک اور مسیحی گرجا گھروں کے مابین غم وغصہ کا ایک طوفان ہے، رنج وملال کی ایک لہر ہے، وہ اس عظیم فیصلہ پر ماتم کناں وچیں بہ جبیں ہیں، اور تعجب تو اس بات پر ہے کہ عرب کے بعض منافقوں کا ٹولہ اور یونیسکو کی متعدد تنظیمیں و جماعتیں بھی اس ناپاک رویہ میں ان کے شانہ بشانہ نظر آرہی ہیں۔

جبکہ ترکی اور صدر ترکی جناب رجب طیب اردوغان کی جانب سے لیا گیا یہ فیصلہ بڑا دانشمندانہ فیصلہ ہے، مسئلہ کلیسا کی مسجد میں تبدیلی یا کلیسا سے میوزیم میں تبدیلی کا نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ اس پر مصر ہیں اور اسی کو ثابت کرنے کی کوششیں کررہے ہیں اور نہ ہی کلیسا کو معطل کئے جانے کا ہے بلکہ اصل مسئلہ تو مسجد کی اپنی سابقہ ھیئت پر بحالی کا ہے۔ صدیوں سے جو مسجد آباد تھی جس کو ۱۹۳۵ء میں بند کردیا گیا اس کی بحالی کی بات ہے، اس پر یورپین ممالک ومسیحی دنیا کا اضطراب چہ معنیٰ دارد؟ اس بات سے وہ کیوں چراغ پا اور چیں بہ جبیں ہیں کہ ''آیاصوفیہ'' کی عمارت کو میوزیم کی حیثیت سے ختم کرکے اس کو دوبارہ مسجد کے لئے بحال کیا جارہا ہے کہ اس میں ذکر اللہ کے زمزمے اور تلاوت قرآن کے نغمے بلند ہوں۔

کیا ارباب مسیحیت اس کو گوارا کریں گے کہ وہ مسجد اللہ کی عبادت وتلاوت قرآن کریم کے لئے نہ کھولی جائے بلکہ اس کی حیثیت صرف ایک تفریح گاہ ومیوزیم کی باقی رہے، لوگ سیر وسیاحت کی غرض سے اس کو روندتے رہیں اور کھیل تماشے ہوتے رہیں، مسیحیت کے علمبردار و مذہبی رہنما ان دونوں باتوں میں سے کس کو پسند کریں گے؟ جبکہ قرآن کریم میں اللہ کا صاف ارشاد ہے: "ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع و بيع وصلوت و مسجد يذكر فيها اسم الله كثيراً، ولينصرن الله من ينصره، إن الله لقوى عزيز"، (اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ٹکراتا تو کتنی خانقاہیں، اور کلیسا، اور

عبادت گاہیں، اور مسجدیں مسمار کردی جاتیں، جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا رہا، اور لیا جاتا ہے، اور اللہ ان کی ضرور مدد کرے گا جو اللہ کے مشن کی مدد کریں گے، بے شک اللہ طاقت والا اور غالب ہے۔)

اس قرآنی پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو مسیحی دنیا اس بات کی زیادہ حقدار تھی کہ وہ اس فیصلہ پر اپنے اطمینان و رضامندی کا اظہار کرتی کہ اس مسجد کی بحالی ہو اور تعلیم و تربیت کا ایک مقدس نظام وجود میں آئے اور اس بات کے لئے فکرمند ہوتی لیکن ایسا نہیں ہوا۔

رہی بات ''آیا صوفیہ'' کی کلیسا سے مسجد میں تبدیلی کی تو اس واقعہ کو پانچ سو سال سے زائد کا عرصہ بیت چکا ہے، کہ سلطان محمد الفاتح نے اس کو بزور شمشیر فتح کیا، اور اس اراضی کے عوض خطیر رقم بھی پیش کی اس لیے موجودہ ترکی اور اس کے صدر رجب طیب اردوغان پر طعن وتشنیع نہ کی جائے۔ اس مرد مجاہد نے تو صرف مسجد کی بحالی کی کوشش کی ہے، اور بہت وضاحت کے ساتھ اس بات کو رجب طیب اردوغان نے اپنے خطاب میں کہہ دیا ہے، اور اپنی بصیرت کا استعمال کرتے ہوئے اس مرد غیور نے یہاں تک کہہ دیا ہے ''کہ ان شاء اللہ العزیز'' آیا صوفیہ کی بحالی مسجد اقصیٰ اور القدس کی بازیابی کا پیش خیمہ ہے، پھر یہ تاویلات لنگ کیوں کی جارہی ہیں؟ بے سروپا باتوں کا ہجوم کیوں ہے؟

اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض بھی کرلیں کہ کلیسا کو مسجد میں تبدیل کیا جانا غلط ہے تو یہ بات بھی ہمارے حق میں ہوگی کیونکہ اسپین و روس اور صقلیہ (Sicilia) اور یوگوسلاویہ (Yugoslavia) کی سینکڑوں مسجدیں جو باڑوں یا قہوہ خانوں میں تبدیل کردی گئیں ہیں ان سب کو بحال کیا جائے، ان سب سے ظالمانہ قبضے وتسلطات کے خاتمہ کے اعلانات ہوں، اور بہت دور جانے کی بھی ضرورت نہیں ہے برما، چین، اور ہندوستان کی حالت زار کا تو پوچھنا ہی کیا؟ خود فرانس میں حالیہ چند سالوں میں زائد از پچاس مسجدیں مقفل و معطل کی جاچکی ہیں، اس کا ذمہ دار کون ہے؟ بلا وجہ چراغ پا ہونے والوں اور اعتراض کرنے والوں سے ہمارا ایک سوال ہے کہ ''آیا صوفیہ'' کو ترکی اگر میوزیم سے کسی کلب یا عالمی سنیما گھر میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کرتا تو آپ کی نیندیں حرام ہوتیں؟ اپنی مہر سکوت توڑتے؟ یا مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے؟

اور نام نہاد انسانیت کے ٹھیکے دار اور اجارہ دار جو ''انسانی ورثہ کا راگ الاپ رہے ہیں ان کو معلوم ہوجانا چاہیے کہ یہ عمارت کہیں نہیں جائیگی، ویسے ہی محفوظ رہے گی بلکہ اس سے بہتر حالت میں نظر آئیگی۔

اعتراضات و اشکالات کرنے والے منافقین کے لئے اتنا ہی کافی ہے، اور میں ان سے یہ بات صراحت کے ساتھ کہنا چاہوں گا ورنہ وہ اس بات کا برملا اعتراف کرلیں کہ وہ شریعت اسلامی کے خلاف ہیں، صلیبی وصہیونی جماعتوں کے حمایتی و حاشیہ خور ہیں، نماز و روزہ کے دشمن ہیں، قرآنی تلاوت وتعلیمات کے منکر ہیں۔

☆☆☆

❑ قضیۂ ایاصوفیہ

ترکی کی مسجد ایاصوفیہ کا قضیہ

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

ترکی کی عدالتِ عالیہ نے ایاصوفیہ کی عمارت کو مسجد میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کردیا ہے، جس کے بعد اب اس کے میناروں سے اذان کی صدائیں بلند ہونے لگی ہیں۔ اس فیصلے پر مخالفت اور موافقت دونوں طرح کی آرا عالمی سطح پر سامنے آرہی ہیں اور ان کی بازگشت ہندوستان میں بھی سنائی دے رہی ہے، چنانچہ جہاں ایک طرف اس فیصلے کا پُرجوش استقبال کیا جارہا ہے تو دوسری طرف بعض دانش وروں کی جانب سے اس پر نکیر کی جارہی ہے اور کہا جارہا ہے کہ ایاصوفیہ کے چرچ کو مسجد میں تبدیل کیے جانے کی تائید ہندوستان میں بابری مسجد کو مندر میں تبدیل کیے جانے کی تائید کے مثل ہے۔ ایک جانب ہندوستان میں مسجد کو مندر میں تبدیل کیے جانے کی مخالفت کی جائے اور دوسری طرف ترکی میں چرچ کو مسجد میں تبدیل کیے جانے کی تائید کی جائے، یہ تو متضاد رویّہ ہے۔

جہاں تک اس موضوع پر شرعی موقف کا سوال ہے تو اس سلسلے میں کتبِ فقہ میں مفصل بحثیں ملتی ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض ممالک صلح سے فتح ہوئے ہیں اور بعض بزورِ قوت۔ صلح کے ذریعے فتح حاصل ہونے کی صورت میں اسلامی ریاست پابند تھی کہ شرائطِ صلح پر عمل کیا جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں بیت المقدس صلح کے ذریعے فتح ہوا، جس میں یہ شرط بھی تھی کہ تمام مسیحی مقدّسات باقی رکھے جائیں گے، چنانچہ حضرت عمر نے اس معاہدہ صلح کی پاس داری کی۔ جو ممالک بزورِ قوت فتح ہوئے ان کے بارے میں فقہاء کی دونوں طرح کی رائیں ہیں: بعض کہتے ہیں کہ ان میں بھی دیگر مذاہب کی عبادت گاہیں ان کے پیروکاروں کے تصرف میں رہیں گی اور بعض کہتے ہیں کہ ان میں مسلم حکم رانوں کو تصرف کرنے کا اختیار ہوگا۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ بزورِ قوت فتح کیے جانے والے ممالک میں حکم راں کو اختیار ہوگا کہ وہ بتقاضائے مصلحت قدیم عبادت گاہوں کو باقی رکھ سکتا ہے، جیسا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ خیبر کے ساتھ معاملہ کیا تھا اور خلفائے راشدین نے اپنے مفتوحہ ممالک میں کیا تھا۔

جہاں تک قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) کا معاملہ ہے، اسے سلطان محمد الفاتح (م 1481ء) نے 1453 میں بزورِ قوت فتح کیا تھا۔ ایاصوفیہ قسطنطنیہ کا مشہور چرچ تھا۔ اسے

آرتھوڈوکس کلیسا کے عالمی مرکز کی حیثیت حاصل تھی_ اس کی بنیاد چوتھی صدی عیسوی میں رومی بادشاہ قسطنطین نے ڈالی تھی۔ ایک ہزار برس تک یہ عمارت عیسائیوں کے مذہبی و روحانی مرکز کے طور پر استعمال ہوتی رہی تھی۔ قسطنطنیہ کو بزور قوت فتح کر لینے کے بعد مسلم حکم راں کو شرعی طور پر اس میں تصرف کر لینے اور اسے اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنے کا اختیار حاصل تھا اور یہ چیز اس وقت کے بین الاقوامی قوانین اور حکم رانوں کے تسلیم شدہ رویّوں کے خلاف بھی نہیں تھی۔ اس سے قبل مسیحی حکم راں اندلس کے مختلف شہروں پر قبضہ کرنے کے بعد بڑی بڑی مساجد کو چرچوں میں تبدیل کر چکے تھے۔ ان سلطان فاتح نے زبردستی ایا صوفیہ پر قبضہ کر کے اسے مسجد میں تبدیل نہیں کیا، بلکہ خطیر مال صرف کر کے اسے مسیحیوں سے خریدا۔ (سوشل میڈیا پر وہ دستاویزات عام ہو گئی ہیں جن میں خرید و فروخت کی تفصیلات مذکور ہیں۔) اس کے بعد چرچ میں جو تصاویر اور مجسمے موجود تھے ان میں سے کچھ کو مٹا دیا گیا اور کچھ کو چھپا دیا گیا اور اس کے میناروں میں بھی اضافہ کیا گیا۔ اُس وقت سے سلطنتِ عثمانیہ کے خاتمہ تک یہ عمارت 'مسجد ایا صوفیہ' کے نام سے مشہور اور مستعمل رہی۔ کمال اتاترک نے جب خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کا اعلان کیا تو اس نے 1931 میں مسجد میں تالا ڈلوا دیا۔ 4 برس کے بعد 1935 میں اسے دوبارہ کھولا تو گیا، لیکن میوزیم کی شکل میں۔

اس موضوع پر کئی پہلوؤں سے غور کرنے کی ضرورت ہے:

☆ عیسائیوں کے یہاں اپنے چرچوں کو فروخت کر دینا عام بات ہے_ اس کا اب بھی رواج ہے_ اچھی قیمت ملنے پر اپنی عبادت گاہوں کو فروخت کر دینا ان کے نزدیک کوئی عیب نہیں_ چنانچہ یورپ کے بہت سے چرچ شراب خانوں اور مالس میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ اگر اس معاملہ میں قصور بنتا ہے تو ان مسیحی مذہبی رہ نماؤں کا جنھوں نے اپنی مرضی سے اپنی مذہبی عبادت گاہ کا سودا کر لیا۔

☆ اس وقت معاملہ یہ نہیں ہے کہ ترکی حکومت نے کسی چرچ کو تبدیل کر کے مسجد بنانے کا فیصلہ کیا ہو، بلکہ اس وقت معاملہ یہ تھا کہ ایک مسجد کو، جس میں 478 برس سے باقاعدہ نماز پڑھی جا رہی تھی، 1935 میں میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا تھا، عدالتِ عالیہ نے اس کی سابقہ مسجد کی حیثیت بحال کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور حکومت نے عدالت کے فیصلے کو نافذ کرنے کا اعلان کیا ہے۔

☆ قابلِ مذمّت یہ رویّہ ہے کہ کہیں ظالمانہ طریقے سے کسی عبادت گاہ پر قبضہ کر لیا جائے اور اس کی حیثیت کو تبدیل کر دیا جائے_ یہ ظالمانہ طریقہ پہلے بھی اختیار کیا جاتا رہا ہے، چنانچہ اندلس کی بے شمار مساجد چرچوں میں تبدیل کر دی گئیں اور اب بھی اس رویّے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے، چنانچہ مسجد اقصیٰ کی حیثیت کو تبدیل کرنے کی مجرمانہ کوششیں کی جا رہی ہیں_ لیکن اس ظلم و جبر اور صریح دھاندلی پر عالمی ضمیر پہلے بھی خاموش تھا اور اب بھی اس کی طرف سے کوئی آواز نہیں اٹھ رہی ہے، لیکن مسجد ایا صوفیہ کے معاملے میں، جہاں ظلم و زیادتی کا کوئی ثبوت نہیں ہے، اس کے خلاف وہ خوب شور و غوغا بلند کر رہا ہے۔ یاللعجب!

☆☆☆

❑ قضیۂ ایاصوفیہ

قسطنطنیہ سے استنبول بننے کی کہانی
آیا صوفیہ کے منبر سے عالمی سیاست کو ترکی کا پیغام

ڈاکٹر عمیر انس، انقرہ، ترکی

تاریخ کی سب سے اچھی اور بدترین بات یہ ہے کہ جب اس پر دور سے نگاہ دوڑائی جائے تو لگتا ہے کہ یہ کوئی بنی بنائی فلم جیسی آسان پلاٹ والی کہانی ہے۔ قریب جائیں تو لگتا ہے کہ یہ ارطغرل جیسا نہ ختم ہونے والا ڈرامہ ہے۔ اگر ہم اس کے اور قریب جائیں گے تو ایسا معلوم ہوگا کہ ارطغرل تو صرف ایک حصہ ہے اور کہانی تو اور لمبی ہے۔ ترکی میں آیا صوفیہ نام کا بازنطینی سلطنت کا قلعہ جو عثمانی سلطنت میں ایک مسجد بن گیا تھا اور جسے کمال اتاترک نے میوزیم بنا دیا تھا اب اس کی میوزیم کی حیثیت ختم کر دی گئی ہے اور مسجد کی حیثیت بحال کر دی گئی ہے۔ ترکی میں اور ترکی کے باہر بہت سے مسلمان اور غیر مسلم بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ اسلام کی عیسائی عقیدے پر جیت ہے۔ بہت سارے مسلمان جشن منا رہے ہیں اور بہت سے غیر مسلم اس عمل سے ناخوش ہیں۔ اگر دنیا بالکل مثالی نظریاتی طریقوں پر عمل پیرا ہوتے ہوئے یہاں تک پہنچی ہوتی تو آیا صوفیہ مسجد کا چرچ سے مسجد، مسجد سے میوزیم اور میوزیم سے پھر مسجد بنانے کا سارا ڈرامہ ناجائز لگتا۔

کیا ضرورت تھی کہ عیسائیت کے علم بردار ارسطو اور افلاطون جیسے فلسفیوں کے علاقوں میں جاتے، لیکن یہ کام تو خود سکندر اعظم نے بھی کیا تھا اور سکندر اعظم نے یہ کام اسی لیے کیا تھا کیونکہ سلطنت فارس نے اس کے ملک کو پریشان کر رکھا تھا۔ ہمیں فلسفیوں کے ملک کی عیسائیت کے علاقے میں تبدیلی کو ذہن میں رکھنا چاہیے، لیکن جیسے جیسے یورپ میں عیسائیت کی تشہیر ہوتی گئی روم، استنبول سے زیادہ طاقتور ہوتا چلا گیا، لہذا وہ اپنے آپ کو استنبول کے چرچ سے زیادہ اہم سمجھنے لگے۔ استنبول اور روم کے مسیحی پادریوں کے مابین تنازعہ اتنا بڑھ گیا کہ 1054 میں رومن چرچ نے استنبول چرچ سے اپنے آزاد ہو جانے کا اعلان کر دیا اور پورے یورپ میں استنبول چرچ کو الگ تھلگ کرنے کی سازش کرنے لگا۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے اسلام عرب سے شروع ہوا اور ایران سے ہو کر مصر پہنچا، لیکن کچھ ہی عرصے بعد سب نے آپس میں لڑ جھگڑ کر اپنی الگ الگ اسلامی ریاست کا اعلان کر دیا۔ ہندوستان کے ہندو بادشاہوں کے مابین بھی یہی ہوا، وسطی ایشیا کے فارسی اور ترکی بولنے والے پٹھانوں کے مابین بھی یہی ہوا۔ سب جانتے تھے کہ مذہب ایک مرکزی ریاست کی بنیاد نہیں بن سکتا اور سیاست بھی یہی ہے۔ اس دور میں مذہب ہی سیاست تھا اور سیاست ہی مذہب۔ روم کے چرچ نے

عیسائی دنیا میں اپنا تسلط بڑھانے کے لیے 1091ء میں صلیبی جنگوں کا اعلان کیا تھا،لیکن استنبول چرچ یعنی قسطنطنیہ اس اعلان پر شکوک وشبہات کا شکار تھا، کیونکہ اس کو خدشہ تھا کہ رومن چرچ قسطنطنیہ کو اپنے دائرے میں لانے کے لیے سازش کررہا ہے۔ اور یہی خوف قسطنطنیہ کے چرچ اور مسلمانوں کے درمیان اندرون خانہ تعاون کی وجہ بنا۔ جب پہلی صلیبی جنگ میں رومن چرچ کمزور پڑا تو اس نے بازنطین کے کومنوس (1080–1143) پر الزام لگایا کہ اس نے مسلمانوں سے مفاہمت کرلی ہے اور جب رومن چرچ نے شام کے متعدد علاقوں کو فتح کرلیا اور اس کو سلطنت قسطنطنیہ میں شامل کرنے سے انکار کردیا تو مغرب اور ایشیاء کے گرجا گھروں کے مابین عدم اعتماد کھل کر سامنے آیا۔ چنانچہ رومن چرچ پھلنے پھولنے لگا اور وینس دنیا میں ایک بڑے تجارتی مرکز کے طور پر ابھرنے لگا جبکہ قسطنطنیہ کے چرچ کا صرف بلقانی ممالک پر ہی مکمل انحصار رہ گیا۔ جب ایڈرونکس، قسطنطنیہ کے تخت پر بیٹھا تھا تو اس کو لاطینی عیسائیوں سے نفرت تھی چنانچہ 80000 لاطینی عیسائیوں کی نسل کشی کی گئی۔ 1185ء میں ایڈورنکس کا بھی تختہ الٹ دیا گیا۔

12 اپریل 1204ء کو صلیبی فوجوں نے روم سے استنبول کی طرف مارچ کیا،اس وقت استنبول خوفناک ہنگاموں کا شکار تھا۔ کنگ الیکس فرار ہوگیا تھا اور اس کی جگہ ایلیکسو چہارم کو گدی پر بٹھایا گیا تھا۔لیکن عوام نے الیکسو چہارم کو مارڈالا کیونکہ وہ لاطینی چرچ کا حلیف سمجھا جاتا تھا اور اس کی جگہ الیکسو پنجم کو لایا گیا جو صلیبی جنگ میں شامل ہونے کے خلاف تھا۔اس نے استنبول کے باہر منتظر ہزاروں صلیبی حملہ آوروں کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت دینے سے انکار کردیا،لیکن بالآخر صلیبیوں نے زبردستی داخل ہوکر استنبول کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔اس وقت آیا صوفیہ میں سب سے زیادہ توڑ پھوڑ کی گئی۔ بچے کھچے بازنطین سرداروں نے اپنے اپنے علاقوں کو خودمختار قرار دے دیا اور اندیس کے اندر نائکیہ (نقایہ) سلطنت قائم ہوئی۔ پونٹس ریاست کو تشکیل دینے کے بعد ایلیکو بھائی بھی الگ ہوگئے۔ 1261ء میں ریاست نائکیہ، بازنطینی سلطنت استنبول کو دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔نکیٹاس کنیئٹس نے تیرہویں صدی میں اپنی کتاب ہسٹوریا میں آیا صوفیہ پر لاطینی چرچ کے قبضے کی ایک انتہائی تکلیف دہ کہانی لکھی ہے۔

یہ لمبی کہانی سنانی اس لیے ضروری ہے کیونکہ اسلام اور عیسائیت کے مابین تصادم اور عثمانی قبائل کے ترکی میں پھیل جانے کا سلسلہ خالی ہوا میں شروع نہیں ہوا۔ یہ بات بھی کم دلچسپ نہیں ہے کہ عروج اسلام سے قبل قسطنطنیہ اور عرب قبائل کے مابین بہت دوستانہ مراسم تھے۔اس کی وجہ سلطنت فارس تھی جس سے عرب قبائل ہمیشہ خوف زدہ رہتے تھے اور توازن بنانے کے لیے قسطنطنیہ سے مدد لیا کرتے تھے۔عرب قبائل کا سب سے بڑا شاعر عمار مقدم اپنے والد کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے قسطنطنیہ میں بازنطینی بادشاہ سے مدد لینے گیا تھا لیکن واپسی میں ترکی کے انقرہ میں اس کی موت ہوگئی۔ جوڈٹ ہیرن لکھتا ہے کہ اگر چھٹی صدی میں بازنطین نے عرب ملک کی طرف جو کہ اب مسلمان ہورہا تھا اپنی توسیع کو نہ روکا ہوتا تو عرب قبائل ترک قبائل سے آٹھ سو سال قبل ہی استنبول پر قابض ہوجاتے۔ عروج اسلام کے بعد قبیلے، عیسائیوں اور پارسیوں کو مذہب کی سیاست میں برابر کرنے کے لیے قبائل کی سیاست سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے تھے

لیکن انہوں نے جلد ہی منتشر ہونا شروع کر دیا۔ ادھر ترک اور فارسی قبیلوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا اور اپنی جگہ لینے لگے۔ اس درمیان منگولوں کے حملے بھی ترکی تک پہنچ گئے اور اگر مسلم شہنشاہ انہیں یوروپ کی طرف موڑ دیتے اور ان سے مقابلہ نہیں کرتے تو آج دنیا کا نقشہ بہت مختلف ہوتا۔ 1291ء میں پوپ نے بازنطین کے علاقے میں لاطینی بولنے والے عیسائیوں کو آباد کرنے کے منصوبے کا اعلان کیا جس پر عثمانی سرداروں اور بازنطین چرچ دونوں کے کان کھڑے ہو گئے۔

استنبول پر عثمانیوں کی فتح سے قبل کم از کم تین عثمانی بادشاہوں یا شہزادوں نے بازنطین بادشاہوں کی لڑکیوں یا رشتہ داروں کے ساتھ شادیاں کی۔ اگر چہ مسلم مورخین اکثر اپنے بادشاہوں کی فتح کو مذہبی رنگ میں دکھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ ایسی مثالوں کو چپکے سے نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اس میں ایک اور بات یہ ہے کہ کیا واقعی استنبول کی فتح اتنی بڑی تھی جتنی بعد کے مورخین نے اس کو پیش کیا؟ یہ بات تو تمام مورخین جانتے ہیں کہ عثمانی بادشاہوں نے بازنطینی سلطنت کے جس مرکز پر قبضہ کیا تھا وہ کچھ کلومیٹر کا علاقہ تھا کیونکہ اس کا زیادہ تر علاقہ وہ رومن سلطنت کے ساتھ محاذ آرائی اور باہمی لڑائی میں کھو چکے تھے۔ اگر تیمور نے 1423ء میں انقرہ پر حملہ کر کے عثمانی بادشاہ یلدیرم بایزید کو شکست دے کر قیدی نہ بنایا ہوتا تو اسی سال استنبول فتح ہو سکتا تھا۔ لیکن تیمور کے حملے کے بعد بازنطین بادشاہ نے عثمانی بادشاہوں کے ساتھ معاہدہ توڑ دیا اور کھوئی ہوئی زمین کو واپس لینے کے لیے بیرونی مدد لینے لگا لیکن پھر اسے شکست ہوئی۔ اس بار بازنطین بادشاہ کے بیٹوں کو یہ علاقے مختص کر دیے گئے۔ جسے بعد ازاں ایک بار پھر رومی سلطنت نے قبضہ کر کے اپنے ساتھ الحاق کر لیا۔ جنگ کے آخری سالوں میں عثمانی بادشاہ استنبول کے بجائے یورپ کی طرف بڑھنا چاہتے تھے لیکن استنبول ان کو دوبارہ واپس کھینچ لیتا تھا۔ اس بار انہوں نے یورپ کے تمام بادشاہوں کو خط لکھ کر مدد کی درخواست کی، لیکن کوئی بھی مدد کے لیے آگے نہیں آیا۔ بالآخر استنبول 1453ء میں عثمانی ریاست کا حصہ بن گیا اور سلطان محمد پہلے فاتح کی حیثیت سے استنبول میں داخل ہوا۔ ویسے اسلام میں کسی بھی مذہبی مرکز کو جنگ کے بعد مسجد میں تبدیل کرنا یا اسے توڑنا اور اسے نقصان پہنچانا ممنوع ہے لیکن آیا صوفیہ کو مسجد بنا دیا گیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ آیا صوفیہ صرف ایک چرچ نہیں تھا بلکہ یہ بازنطین طاقت کا مرکز بھی تھا۔ ایک مذہبی ریاست ہونے کی وجہ سے شاہ آیا صوفیہ مذہب کے علاوہ بھی تمام سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ وہ اسے توڑ نہیں سکتے تھے کیونکہ یہ چرچ کے طور پر استعمال میں تھا۔ لہذا اس کو مسجد بنایا گیا اور عیسائی مذہبی رہنماؤں کو بھی وہاں آنے کی اجازت دی گئی۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ جب مسلمانوں اور یہودیوں کو اسپین سے جلاوطن کیا گیا تھا تو انہیں تحریری احکامات کے ساتھ نکالا گیا تھا اور ان کی تمام جائیدادوں پر قبضہ کر لیا گیا تھا۔ لیکن استنبول میں عیسائیوں کو مکمل حقوق کے ساتھ تحریری طور پر رہنے کی اجازت دی گئی تھی۔ کیونکہ عثمانی بادشاہ بخوبی واقف تھے کہ آرتھوڈوکس عیسائیوں کو تو رومن کیتھولک عیسائیوں نے ہی سب سے زیادہ نقصان پہنچایا اور وہ استنبول کے علاوہ کہیں اور نہیں جا سکتے تھے۔

پرانی کتابوں میں یہ کہانی یہ بھی لکھی ہے کہ تین عیسائی پادری جن کو اپنے سیاسی جرائم کی وجہ سے جلاوطنی کا حکم

دیا گیا تھا، انہوں نے یہ کہتے ہوئے معافی مانگی کہ انہیں کیتھولک عیسائی مار ڈالیں گے لہذا وہ مسلمانوں کے ساتھ رہنا پسند کریں گے۔ تب محمد سلطان نے انہیں اس کام پر لگایا کہ وہ پوری ریاست میں مسلم افسران کے کاموں کی کوتاہیوں کو نکال کر لائیں اور انہیں بتائیں۔ پوپ نکولس نے 1452ء میں آرتھوڈوکس کے رہنماؤں کو روم کے ساتھ صلح کے لیے قائل کرنے کارڈنل آئسیڈور کو استنبول بھیجا۔ آئیسڈور لگ بھگ 1000 تیرانداز لے کر استنبول پہنچا لیکن اس کی سننے والا کوئی نہیں تھا۔ آرتھوڈوکس، بارہویں صدی میں رومی چرچ کے صلیبی جنگ کے نتیجے میں استنبول پر قبضہ اور آیا صوفیہ کی پامالی کے زخموں کو فراموش نہیں کر پائے تھے اور آئیسڈور آیا صوفیہ میں لڑتے ہوئے پکڑا گیا اور پھر کسی طرح اپنی جان بچانے کے بعد فرار ہوگیا۔ جوڈیٹ ہرین لکھتا ہے کہ جب سلطان محمد نے قسطنطنیہ فتح کر لیا تو آیا صوفیہ کے ایک پادری لوکاس نوٹریس کو چرچ کا سرپرست بنایا۔ لیکن رومن چرچ کی طرف سے اس کو لالچ دیا گیا کہ وہ واپس آجائے تاکہ ساتھ مل کر استنبول واپس لینے کی کوشش کی جائے تو لوکاس نے جواب دیا کہ ترک پگڑی منظور ہے مگر پوپ کا تاج قبول نہیں۔ جبکہ دوسری طرف روم میں بیٹھے پوپ جان ہشتم نے سلطان محمد کو استنبول فتح کرنے پر مبارکبادی بھیجی۔

بحث کا دوسرا حصہ آیا صوفیہ اور مسلمانوں سے متعلق ہے، لیکن پہلے حصے سے یہ بات تو صاف ہے کہ استنبول کی فتح اسلام اور نصرانیت کی لڑائی نہیں تھی بلکہ یہ نصرانیت کے مختلف فرقوں کی آپسی خونریزی کا ایک منطقی انجام تھا جس کو اس وقت اناطولیہ کے عثمانی حکمران ہی ایک مستحکم اور پرامن ماحول فراہم کر سکتے تھے، اب اس ضمن میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا صوفیہ مسجد کیسے بن گئی جبکہ اسلام دوسرے مذاہب کے عبادت خانے کو اسلامی عبادت گاہ کے طور پر استعمال کرنے کی حوصلہ شکنی کرتا ہے؟

ہندوستان میں یہ بات کہی جارہی ہے کہ اس جگہ کو خریدا گیا ہے اس لیے اسے مسجد بنانا جائز ہے۔ اگر کسی مذہب کے لوگ اپنی مذہبی عبادت گاہ کو فروخت کرنا چاہتے ہیں تو علماء نے لکھا ہے کہ ایسی عبادت گاہ کو خریدنا بھی جائز ہے اور اس کو مسجد میں تبدیل کرنا بھی جائز ہے۔ ایسی عبادت گاہ کو خرید کر مسجد بنانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن آیا صوفیا کے بارے میں یہ کہنا کہ آیا صوفیا کی خریدی کے بہت مضبوط دلائل یا تاریخی دستاویز پیش نہیں کیے جا سکتے، ممکن ہے کہ علامت کے طور پر بیع منعقد ہوئی ہو۔ صحیح نہیں زیادہ درست بات یہ محسوس ہوتی ہے کہ چونکہ مسلمان حکمران عموماً عبادت گاہوں کا احترام کرتے تھے اور ان کی حفاظت پر توجہ بھی دیتے تھے جیسا کہ ہندوستان کے متعدد مندروں کے سلسلے میں عالمگیر اورنگ زیب کے احکامات سے ظاہر ہوتا ہے، سلطان محمد فاتح کی فتح کے بعد دیے گئے احکامات سے بات واضح ہے کہ وہ قسطنطنیہ کی آرتھوڈوکس عیسائی آبادی کے مذہبی اور شہری حقوق کی حفاظت کے لیے نہ صرف متوجہ تھے بلکہ عملاً سرگرم بھی تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی بھی جنگی احکامات عمومی نہیں ہوتے ہیں جیسے کہ خواتین کو نشانہ بنانے پر سخت پابندی ہے لیکن اگر ایک خاتون خود فوجی ہو اور ہتھیار بند میدان جنگ میں موجود ہو تو اسے عام فوجی کی طرح سے مانا جائے گا، اسی طرح سے یہ بات تمام دلائل سے واضح ہی ہے کہ اس زمانے میں چرچ کے ذمہ داران ہی حاکم ہوا کرتے تھے، وہی جنگ اور امن کے فیصلے لیا کرتے تھے، چرچ ہی سیاسی اور عسکری فیصلے کیا کرتا تھا

اور یہ صورتحال مسلمان ریاستوں سے بالکل مختلف ہوا کرتی تھی جہاں مذہب اور ریاست کے ادارے واضح طور پر الگ الگ ہوتے تھے۔ مساجد کے ائمہ کے پاس کبھی بھی سیاسی اور عسکری نوعیت کے اختیارات نہیں ہوتے تھے، اس اعتبار سے آیا صوفیا چرچ کی وہ حیثیت نہیں تھی جو آج کے زمانے کے چرچ کی ہے۔ آج کے چرچ ایک طویل خانہ جنگی کے بعد امور ریاست سے بے دخل کیے جا چکے ہیں۔ آیا صوفیا ہی سیاسی اور عسکری فیصلوں کا مرکز تھا اور بین الاقوامی تعلقات کا مرکز بھی وہی تھا اس لیے اس زمانے کے چرچوں کے ساتھ محض عبادت گاہ کا سلوک کیا جانا عملاً ممکن ہی نہیں تھا۔ مثلاً اگر آیا صوفیا کو اس وقت چرچ کے طور پر چھوڑ دیا جاتا تو یا تو اس کو رومن چرچ کے ماتحت کر دیا جاتا جس کا آرتھوڈوکس عیسائیوں نے انکار کر دیا تھا، یا پھر آرتھوڈوکس ریاست کو علامتی طور پر تسلیم کر کے ان کے نمائندوں کے حوالے کیا جاتا، اور چرچ اس زمانے میں بلکہ آج بھی اکیلے اپنی بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتے۔ اس اعتبار سے آیا صوفیا کو ایک ریاست کے سیاسی اور عسکری مرکز ہونے کی بنا پر قبضے میں لینا ہی واحد حل تھا، لیکن باقی متعدد چرچ جو محض عیسائیوں کی عبادت کے لیے استعمال ہوتا تھا انہیں باقی رکھا گیا اور ان کے ذمہ داران کا تقرر خود سلطان فاتح نے کر کے ان کے وظیفے بھی مقرر کیے۔ 1934 میں مسجد سے میوزیم بنانے پر اعتراضات کیے گئے۔ مسلمانوں کا یہ کہنا تھا کہ مسجد سے جو میوزیم بنایا ہے وہ یوروپ اور امریکہ کے دباؤ میں ان کو خوش کرنے کے لیے بنایا ہے۔ بعض نے الزام لگایا کہ آپ اسلام کو پسند نہیں کرتے اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا یہ فیصلہ غلط تھا، لیکن اس فیصلے کو نہیں بدلا گیا۔ 1963 میں سلیمان دیمیرل جو بعد میں پرائم منسٹر اور صدر بھی بنے انہوں نے بھی اپنی پارٹی کی جانب سے مطالبہ کیا کہ آیا صوفیا کو مسجد بنا دیا جائے لیکن اس وقت بھی اس بات کو نہیں مانا گیا۔ ترکی سیاست اپنے آغاز سے تین حصّوں میں تقسیم تھی، پہلا وہ گروہ جو یہ چاہتا تھا کہ عثمانی خلافت کو ختم کرنے کی بجائے ایک نیا عثمانی نیشن اسٹیٹ بنایا جائے جو اگرچہ خلافت کی طرح نہ ہو لیکن جس میں عثمانی خلافت کے تمام علاقوں کے تمام طبقات کو عثمانی نیشنل مانتے ہوئے یکساں حقوق کا تحفظ ہو، دوسرا گروہ وہ تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ عثمانی خلافت کی بنیاد اسلام ہے اس لیے دنیا کے سبھی مسلمانوں پر مشتمل ایک نظام حکومت ہو۔ اس فکر کو پان اسلامزم کے نام سے جانا جاتا ہے، جبکہ تیسرا فریق وہ تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ دونوں ہی نظریے ناقابل عمل ہیں، اس نظریے کی تائید میں یوسف کراچا نے بیحد موثر تحریریں لکھیں اور مصطفیٰ کمال اس فکر سے بہت قریب تھے، بعد میں سبھی طرح کے ترک سیاستداں مصطفیٰ کمال کے شانہ بشانہ ہو گئے اور مصطفیٰ کمال کی سیاسی جماعت سبھی طرح کے سیاسی افکار کی کانگریس بن گئی لیکن مصطفیٰ کمال کی زندگی میں ہی شدت پسند نیشنلسٹ حضرات نے ترکی کو جدید مغربی اور سیکولر ریاست بنانے میں شدت دکھائی جس کی وجہ سے پارٹی میں مذہبی اور عثمانی فکر کے حاملین پارٹی سے رخصت ہونے لگے اور الگ الگ جماعتیں بننے لگیں۔

انھی سیاستدانوں میں سے عدنان مندریس تھے جنہیں مذہبی رجحانات رکھنے کے جرم میں پھانسی دی گئی اور دوسرے سیاستداں سلیمان ڈمیریل تھے جنہوں نے آیا صوفیہ کو مسجد میں دوبارہ بدلنے کا مطالبہ کیا، ترکی کی موجودہ حکمران پارٹی ترکی کے موخر الذکر دونوں رجحانات کے حاملین کی جماعت ہے، یہ نہ تو اخوان کی جیسی سیاسی اسلام کی حامل

جماعت ہے نہ مسلم لیگ کی طرح خالص قوم پرست جماعت ہے۔ اسی لیے اس جماعت میں ترکی کے سب سے زیادہ سیاسی، سماجی اور فکری رجحانات کی نمائندگی ہو جاتی ہے۔ اور اسی لیے ایک ایسے وقت میں جب ترکی کو متعدد خارجی چیلنجز اور معاشی مسائل نے گھیر لیا ہے صدر ترکی کی سیاسی مقبولیت میں کمی بھی آئی ہے تو آیا صوفیہ کے ایک پرانے مطالبے کو پورا کرکے ترک سیاست کا قبلہ کمالزم سے بدل کر عثمانیزم کی طرف کر دیا گیا ہے، لیکن عثمانیزم کی تعریف میں مغربی محققین کی طرح غلط فہمی رکھنے والوں کو ترک محقق بہلول وزکان کی From the Abode of Islam to the Turkish Vatan: The Making of a National Homeland in Turkey کتاب ضرور دیکھنی چاہیے۔

1934 میں ترکی بہت بڑا ایمپائر تھا جو سکڑ کر چھوٹا ہو گیا تھا جسے بیرونی مدد کی ضرورت تھی۔ اس وقت دباؤ کا دور تھا اس لیے ہوسکتا ہے یہ فیصلہ اسی وجہ سے لیا گیا ہو۔ اسی زمانے میں زیادہ تر ممالک آزاد ہوئے۔ یہ فیصلہ 40 سال پہلے اسی زمانے میں لیا گیا ہوتا تو کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے تھا اور اس کے بعد ہی یہ قدم اٹھانا چاہیے تھا۔ فیصلہ متنازعہ اس لیے نہیں ہے کہ یہ چرچ کے خلاف ہے بلکہ اسلاموفوبیا کی وجہ سے ہے۔ ترکی بہت زیادہ اسلام پسند ہے اس لیے یہ فیصلہ لیا گیا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی میڈیا میں بڑا ایشو بن جاتا ہے اس لیے یہ فیصلہ بھی ایشو بن رہا ہے۔ ترکی کی حکومت کی جانب سے کہا جا رہا ہے کہ یہ فیصلہ عیسائیوں کے خلاف نہیں ہے بلکہ وہ معاہدہ پر قائم ہے۔ اس کو مسجد بنانے کے باوجود بھی دنیا بھر کے عیسائی یہاں آسکتے ہیں اور عبادت کر سکتے ہیں۔ کسی کو آنے جانے کی ممانعت نہیں ہوگی۔ ان کو بھی حقوق حاصل ہیں اور وہ بھی برابر کے شہری ہیں۔ اس بات کو اور واضح انداز میں کہنے کی ضرورت ہے۔

مقامی سطح پر جب طیب اردوگان کی پارٹی کمزور ہو رہی ہے اور دیگر پارٹیاں مضبوط ہو رہی ہیں۔ اس فیصلے سے ان کی پارٹی کو مضبوطی حاصل ہوگی لیکن گلوبل سطح پر اس کا بہت اثر ہوگا۔ 2002ء میں ان کا نعرہ تھا کہ وہ یوروپی یونین کا ممبر بننا چاہتے ہیں۔ 2010ء تک محنت کی لیکن یوروپی یونین انہیں ممبر نہیں بنانا چاہتا ہے۔ صرف اس لیے کہ ترکی مسلم ملک ہے اس لیے انہیں یوروپی یونین میں شامل نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس بات سے اب ترکی باخبر ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ ترکی کے حریف ممالک جیسے فرانس جس نے کبھی ترکی پر قبضہ کیا تھا۔ اور 1915 کے بعد جرمنی نے۔ یہ لوگ خود کو سیکولر کہتے ہیں لیکن اسلاموفوبیا سے متعلق سب سے زیادہ جرائم وہیں پر ہیں۔ حالیہ فیصلے سے اب پورے یوروپ میں اس کے صحیح یا غلط ہونے پر ڈیبیٹ شروع ہوگا۔ اور اس بات کو تو سبھی جانتے ہیں کہ مسجدوں پر پابندی لگانے کے معاملہ میں سب سے آگے روس، چائنا اور فرانس ہیں اور یوروپ کے کئی ممالک میں تو اس پابندی کے لگانے کی وجہ سے ترکی نسلی مسلمان متاثر ہوتے ہیں۔ روس میں ترکی نسل کے مسلمانوں کو سب سے زیادہ ستایا گیا مارا گیا یا ملک بدر کیا گیا، ترک اکثریت علاقہ کریمیا پر ۲۰۱۵ء میں روس کا قبضہ اس کی تازہ ترین مثال ہے، چائنا میں بھی جن مسلمانوں کو ستایا جا رہا ہے وہ ترکی نسل کے مسلمان ہیں۔ یوروپ میں بھی ترکی نسل کے مسلمانوں سے بہت زیادہ نفرت کی جاتی ہے۔ لہذا ترکی نے بھی ان سبھی لوگوں کو جواب دینے کے لیے ایک راستہ اختیار کیا ہے۔ اب دنیا میں کہیں یہ بات نہیں ہوتی ہے کہ روس، چائنا وغیرہ یہ سب کیوں کر رہے

ہیں۔ ورنہ ترکی والے یہ کہیں گے کہ آپ ہماری فکر نہ کریں بلکہ اپنی فکر کریں۔ ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ جو مسلمان ممالک ہیں ان میں قوم پرستانہ جذبات مضبوط ہوں گے اور انہیں مسلم نیشنلزم کی طرف بڑھنے کی ترغیب ملے گی۔

ترکی کے لوگ ترکی کی داخلی سیاست اور داخلی سطح پر پیدا ہونے والی سیاسی بیداری اور سیاسی عزائم کو مکمل کرنے والی انٹرنیشنل سیاست بھی چاہتے ہیں۔ لیکن کچھ نئے ڈیبٹس آنے والے دنوں میں اسلام اور مسلم ممالک کے بارے میں شروع ہو سکتے ہیں۔ ان نئے مباحث کو مسلم مفکرین پہلے ہی سے سمجھ کر اسے مثبت رخ دے پائیں گے یا نہیں ایک بڑا سوال ہے۔

آنے والی نئی بحثوں میں ترکی کی عالمی سیاست بہت گہرا اثر ڈالنے والی ہے، جس طرح سے گزشتہ کئی دہائیوں میں اسلام اور سیاست کی بحث میں ایران اور سعودی عرب کے فکری اور مذہبی افکار کا غلبہ رہا ہے اسی طرح سے آنے والی دہائی میں ترکی اور اس کی فکری انجینئرنگ عالمی سیاست میں موضوع بحث بننے جارہی ہے، سعودی عرب نے پہلے ہی خود کو اسلام کا نمائندہ ہونے کی تاریخی ذمہ داری سے تقریباً دستبرداری اختیار کر لی ہے اور ایران، سیریا اور عراق میں اپنے سنی دشمنانہ موقف کی وجہ سے اور اپنی داخلی سیاست کو ترکی کی طرح ترقی والی سیاست میں بدلنے میں ناکام ہونے کی وجہ سے عالم اسلام میں اپنا وزن کھو چکا ہے، لہٰذا حالیہ دنوں میں ترکی کی سیاسی تاریخ، عثمانی مفکرین اور عثمانی سیاست کو بین الاقوامی تعلیمی اور تحقیقی اداروں میں بڑی توجہ سے مطالعہ کیا جارہا ہے۔ ترک تاریخ میں شاید یہ پہلی بار ہے کہ بہت بڑی تعداد میں ترک حضرات عربی زبان سیکھ چکے ہیں اور ترک سیاست کے بارے میں عالم عربی سے براہ راست گفتگو کر سکتے ہیں۔ عثمانی سیاست کے آخری دور میں یہی کمزوری ترکوں اور عربوں میں بے اعتمادی کی وجہ بنی تھی لیکن اب عرب عوام اور مفکرین ترکی کی حمایت جس طرح سے کر رہے ہیں اس سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عالم عربی میں ترکی ایک قائدانہ کردار کے لیے خود کو تیار کر چکا ہے، بڑے پیمانے پر ترک عربی مزاکرات ہو رہے ہیں اور عالم عربی میں ترک سیاستدانوں کے لیے پہلے سے زیادہ اعتماد کی فضا ہموار ہو رہی ہے، اسی کے ساتھ ایشیاء میں بھی ترکی کے تجارتی اور ثقافتی تعلقات گہرے ہو رہے ہیں، چین اور روس کے ساتھ ترکی کے تعلقات محض بیچنے اور خریدنے والے ملکوں کے نہیں ہیں بلکہ سلامتی اور دفاعی نوعیت کے بھی ہو چکے ہیں، اس لیے ترکی کی سیاست ایشیاء کی سطح سے بھی خود کو مضبوط کر رہی ہے۔ ان سب تیاریوں کے ساتھ جب ترک حضرات مغربی ممالک سے مذاکرات کرتے ہیں تو ان کی خود اعتمادی اور فیصلہ کن گفتگو یورپ کے کئی ممالک کو خوفزدہ کرتی ہے۔ لیبیا، شام اور قبرص میں ترک سیاست بدل چکی ہے، مسجد آیا صوفیہ ہی نہیں بلکہ ترکی سے متعلق ہر چھوٹے اور بڑے موضوع کو اسی لیے بہت باریکی سے مطالعہ کیا جاتا ہے اور اسے تنقید کا موضوع بنایا جاتا ہے۔ اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ خود ہندوستان میں جہاں ایک بڑا طبقہ مغرب نواز ہے وہ اسرائیل، چین، فرانس، روس اور امریکہ میں اسلاموفوبیا کے جرائم اور مساجد کے انہدام یا مسلمانوں کے قتل عام کے واقعات پر عموماً خاموش رہتا ہے لیکن ترکی سے متعلق واقعات کو غیر متوقع توجہ حاصل ہوتی ہے، یہ اسی بدلتی عالمی سیاست کا نتیجہ ہے۔ لیکن اگر ترک ہندوستان تعلقات اس نازک موقع پر بہتر نہیں بنائے گئے تو ہندوستان مغربی ایشیاء میں ایک پائیدار اور مستحکم سیاست کی حد حاصل کرنے کا ایک موقع کھو سکتا ہے۔

☆☆☆

❑ قضیۂ ایاصوفیہ

آیا صوفیہ پر اعتراض کرنے والوں کے لیے
علامہ ابن القیم کی احکام اہل الذمہ سے ملخص تحریر

ترجمانی: حسن عمار

ذمیوں کے احکام

ذمیوں کی تقسیم کے اعتبار سے ملک تین طرح کے ہیں:

ایک وہ ممالک جنہیں مسلمانوں نے ہی قائم کیا ہو اور آباد کیا ہو۔ دوسرے وہ ممالک جو اسلام سے پہلے قائم ہوے تھے، اور پھر مسلمانوں نے ان پر فتح حاصل کی اور ان کی سرزمین اور ان کے باشندوں کے مالک ہوے۔ تیسرے وہ ممالک جو اسلام سے پہلے قائم کیے گئے تھے اور مسلمانوں نے ان پر بذریعہ صلح فتح حاصل کی۔

جہاں تک قسم اول کی بات ہے جیسے کہ کوفہ، بصرہ بغداد، قاہرہ وغیرہ یا ان جیسے ممالک ہیں جنہیں مسلمانوں نے بسایا ہو اور آباد کیا ہو، اگر امام چاہے کہ جزیہ دینے کے بدلے ذمیوں کو باقی رکھے تو یہ جائز ہے، اور اگر امام ان کو اس شرط پر باقی رکھے کہ وہ اس میں اپنی عبادت گاہیں، کلیسا وغیرہ تعمیر کرینگے یا خنزیر اور شراب بیچیں گے یا ناقوس وغیرہ بجائیں گے تو بالکل جائز نہیں ہے۔ اگر شرط لگا دی اور عقد ذمہ بھی ہو گیا، تو عقد و شرط دونوں فاسد ہوں گے۔ تمام ائمہ کا اس پر اتفاق ہے اور کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا ہے۔

اگر یہ کہا جاے کہ ان کلیساؤں کا کیا حکم ہوگا جو ان شہروں میں ہیں جنہیں مسلمانوں نے بسایا ہے؟ تو جواب ہے کہ اسکی دو قسمیں ہیں:- ایک تو وہ کلیسا جو مسلمانوں کے شہر بسانے کے بعد وجود میں آے تو وہ بالاتفاق باقی رہیں گے۔ دوسرے وہ کلیسا جو کسی میدان یا کھلیان وغیرہ میں تھے، مسلمانوں نے اسکے اردگرد آبادکاری کر لی تو اب یہ باقی نہیں رہیں گے۔

دوسری قسم ان زمینوں کی ہے جنہیں مشرکین نے آباد کیا ہو اور بسایا ہو پھر مسلمانوں نے انہیں جنگ کے ذریعہ فتح کیا ہو تو ایسی زمین میں معبد و کلیسا کے وجود کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر پہلے سے اس میں یہ چیزیں موجود تھیں تو انکو باقی رکھا جاے گا یا ڈھا دیا جاے گا؟

اس میں امام احمد کے مذہب میں دو قول ہیں؛ اور امام شافعی اور انکے اصحاب کے نزدیک بھی اسکے بارے میں دو راے ہیں:

ایک تو یہ کہ اسکو منہدم کرنا واجب اور اسکو باقی رکھنا حرام ہے۔ دوسری یہ کہ اسکو باقی رکھنا جائز ہے۔ اسکی دلیل حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے، فرماتے ہیں کہ "جو بھی شہر عجمیوں نے آباد کیا، پھر عربوں کو اللہ نے ان پر

فتح عطا کی اور وہ وہاں قیام پذیر ہوے، تو عجمیوں کا جو کچھ تھا وہ ویسا ہی رہے گا۔ کیونکہ حضور ﷺ نے خیبر کو جنگ کے ذریعہ حاصل کیا تو انکے معابد باقی رہنے دیے اور جو کلیسا موجود تھے انکو منہدم نہیں کیا۔ دوسری جنگوں کے ذریعہ حاصل ہونے والے علاقوں پر بہت سے کلیسا اور معبد کا وجود بھی اسی بات پر دلالت کرتا ہے اور انکے بارے میں یہ بات بھی قطعی طور پر معلوم ہے کہ وہ بعد میں وجود پذیر نہیں ہوے بلکہ فتح سے پہلے موجود تھے۔

اب قول فیصل اس سلسلہ میں یہ ہوگا کہ امام وہ کرے جو مسلمانوں کے لیے زیادہ بہتر ہو۔ اگر مصلحت اس میں ہے کہ اسکو لے لیا جاے اس لیے کہ کلیسا بہت ہوں یا ذمی کم ہوں یا مسلمانوں کو ضرورت ہو، تو مصلحت کے تحت انکو لے لیا جاے گا اور منہدم کر دیا جاے گا۔ اور اگر بعض مصالح کے پیش نظر انکا باقی رکھنا ٹھیک ہو کسی وجہ سے کہ یا تو انکی تعداد زیادہ نہ ہو اور مسلمانوں کو بھی اسکی ضرورت نہ ہو تو باقی رکھا جاے گا۔

اور یہ باقی رکھنا اس طور پر ہوگا کہ وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن قبضہ مسلمانوں کا ہی رہے گا، کیونکہ وہ اب مسلمانوں کی ملکیت ہے اور اب اسکو کفار کی ملکیت میں نہیں دیا جا سکتا۔ اگر امام دیکھے کہ وہ مصلحت ختم ہوگئی ہے تو وہ اسکو ختم بھی کر سکتا ہے۔

اس تفصیل کے ذریعہ تمام دلائل سامنے آ گئے، یہی ہمارے شیخ (علامہ ابن تیمیہ) کا مسلک ہے، خلفائے راشدین، ائمہ عظام اور عمر بن عبدالعزیز رح کا عمل بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ جس کے باقی رکھنے میں مصلحت نظر آئی انہوں نے اسکو باقی رکھا اور جسمیں کوئی مصلحت نظر نہیں آئی اس کو منہدم کر دیا گیا۔ امام احمد بن حنبل نے متوکل بادشاہ کو جنگ کے ذریعہ حاصل کی گئی زمین پر موجود کلیسا کو منہدم کرنے کا فتوی دیا تھا۔

تیسری قسم ان علاقوں کی ہے جن پر بذریعہ صلح فتح ہوئی انکی دو قسمیں ہیں۔

اس بات پر صلح کریں کہ زمین انکی ہوگی اور ان کو جزیہ ادا کرنا ہوگا یا مال پر صلح کر لیں کہ وہ اتنا مال دے دیں اور اس پر معاہدہ ہو جائے پھر انکو کچھ بھی کرنے سے نہیں روکا جائے گا جو کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں وہ کر سکتے ہیں اس لئے کہ زمین تو ان کی ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجران سے صلح کی تھی اور ان سے یہ شرط نہیں لگائی تھی کہ کلیسا اور ڈیرہ وغیرہ نہیں بنائیں گے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ اس بات پر صلح ہو جائے کہ زمین مسلمانوں کی ہوگی اور وہ لوگ مسلمانوں کو جزیہ دینگے البتہ معابد و کلیسا کے متعلق وہی حکم رہے گا جس پر صلح ہوئی ہے کہ انکو باقی رکھا جائے گا اور نئے بنانے اور آباد کرنے کی بھی اجازت ہوگی۔ اس لیے کہ جب یہ بات جائز ہے کہ اس بات پر صلح ہو جائے کہ پورا شہر انکا ہے تو یہ بھی جائز ہوگا کہ صلح اس بات پر ہو جائے کہ شہر کا کچھ حصہ انکا ہو، یہ ضروری ہے کہ وہ اس طرح صلح کر لیں جس طرح عمر رضی اللہ عنہ نے صلح کی تھی اور صلح کو ان شرائط سے مشروط کیا تھا جو عبدالرحمٰن بن غنم کی کتاب میں موجود ہیں؛ یعنی کوئی نیا معبد تعمیر نہیں کیا جاے گا اور کوئی نیا گرجا نہیں بنایا جائے گا۔ اور اگر صلح مطلق ہوئی ہے تو اس کو اس صلح پر محمول کیا جائے گا جس پر عمر رضی اللہ عنہ نے صلح کی تھی اور وہی شرائط بھی رکھے جائیں گے۔ اس لیے کہ وہ اب شریعت کا جز لاینفک ہے، لہذا اس کو بعد کے ائمہ نے مطلق صلح پر محمول کیا ہے.

☆☆☆